نیچریت چیست - از دیں گم شدن

نے قمیص و کوٹ و پتلون و بٹن

سرسیدؒ کا اِسلام

یعنی

سرسید احمد خاں صاحب بانی علیگڈھ کالج کے مذہبی عقائد کا فوٹو اور اُسکی

عالمانہ تردید

از مولوی مشتاق احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ساکن قصبہ چرتھاول

ضلع مظفر نگر

باہتمام منشی عنایت خاں صاحب

نامی پریس دہلی میں طبع ہوا

قیمت مجلد ۶ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ اما بعد فقال اللہ عزوجل۔ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّھُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىھَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰھَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ[1]

اس آیت میں جناب باری عز اسمہ نے دنیا کی بے ثباتی و ناپائداری بیان فرمائی ہے اور تمثیل میں نبات کو اس مناسبت سے بیان فرمایا ہے کہ جیسے نبات (سبزہ۔ زراعت) کو لہلہاتے اور پھولتے پھلتے دیکھ کر نفع کی امید ہوتی ہے پھر اچانک بحکم خدا اسکے نیست و نابود اور کالمعدوم ہو جانے سے مایوسی ہو جاتی ہے ایسے ہی دنیا کی حالت ہے۔ یہ بھی اپنے طالب کو حسن و جمال کی جھلک دکھا کر

[1] جز این نیست کہ مثال زندگانی دنیا کی مانند پانی کے ہے کہ اتارا ہم نے اسکو آسمان سے پس ملگیا اُس سے سبزہ زمین کا اُس چیز سے کہ کھاتے ہیں لوگ اور چارپائے۔ یہانتک کہ جب پکڑتی ہے زمین بناؤ اور زینت پکڑتی ہے اور جانتے ہیں مالک اُسکے یہ کہ وہ قادر ہیں اُوپر اُسکے۔ ناگہاں آتا ہے حکم ہمارا رات کو یا دن کو پس کر دیتے ہیں ہم اُسکو جڑ سے کٹی ہوئی۔ گویا کہ نہ بسی تھی کل۔ اسیطرح مفصل بیان کرتے ہیں ہم نشانیوں کو واسطے اُس قوم کے کہ فکر کرتے ہیں ۱۲

ہاتھ ملتا ہوا چھوڑ دیتی ہی۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہی کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوریئے پر سو رہے۔ جب آپ اُٹھے تو جسم مبارک پر بوریئے کے نشان ہو رہے تھے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ حکم فرماتے تو ہم آپکے لیے فرش کر دیتے حضور نے فرمایا کہ مجھے دنیا سے کیا نسبت۔ میری اور دُنیا کی مثال تو ایسی ہی جیسے ایک سوار درخت کے سایہ تلے کچھ دیر آرام کرے۔ اور پھر اُسکو وہیں چھوڑ کر چلا جاوے۔ پس اِس سے معلوم ہوا کہ انسان کو دُنیا سے ایسا تعلق رکھنا چاہیئے جیسے سوار کا درخت سے۔ اِسکی خوشگوار اور ناپائدار راحتوں میں پڑکر سفر آخرت سے غافل نہ ہو بیٹھے۔

ناظرین! اصل یہ ہی کہ اسلام کا مقصد اصلی اختیار آخرت ہی۔ تو جب انسان دنیوی لذت کیطرف مائل ہوگا کبھی اس مقصد (آخرت) میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہی کہ تمام انبیاء علیہم السلام دنیا کے مقابلے پر ہمیشہ دین ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ ہزار نعمتیں دنیا کی اُنکے سامنے موجود ہوتیں کبھی آنکھ بھر کر نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام باوجود اسقدر وسیع سلطنت رکھنے کے جو کی روٹی کھایا کرتے تھے۔ ابو امامہ رضؓ سے روایت ہی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ مجھ سے میرے رب نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تیرے لیے بطحا مکہ سونے کا کر دوں میں نے عرض کیا نہیں اے میرے رب میں یہی پسند کرتا ہوں کہ ایک روز پیٹ بھر کر کھاؤں۔ اور ایک روز بھوکا رہوں جب بھوکا رہونگا تجکو یاد کرونگا۔ اور جب پیٹ بھریگا تیرا شکر کرونگا۔ علاوہ اسکے اور بہت سی احادیث ہیں جنمیں آپنے دنیا کی مذمت اور حقارت بیان فرمائی ہی الفقر فخری ہی آپ کا ایک ایسا قول ہی کہ جو بلا مزید تشریح تمام حظوظ و لذات دنیوی کے ہیچ اور محض لاشے ہونے کو ثابت کر رہا ہی۔ ایسے ہی کلام الٰہی میں جا بجا دنیا سے نفرت اور آخرت کی رغبت دلائی گئی ہی۔ غرضکہ تمام آیات و احادیث پر غور کرنے سے یہی حاصل نکلتا ہی کہ کتب سماویہ کا نازل ہونا انبیاء علیہم السلام کا مبعوث ہونا محض اِسی غرض کے لیے تھا کہ اہل دنیا کو دُنیا کی بُرائی اور ناپائداری اور آخرت کی بھلائی اور ہمیشگی بتائی جاوے

تاکہ یہاں دل لگا کر آخرت کو نہ بھول بیٹھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اسوقت تک جتنے
بزرگان اُمت گذرے ہیں اُنمیں سے ہر ایک دُنیا کی حقیقت ایسا ہی سمجھتا رہا ہی جیسے کہ اُن سے
پہلے بزرگ نے سمجھی تھی طبیب اُمت اور مصلح اُمت کا خطاب بھی اُسی کو ملا ہی کہ جو خود بھی دنیا سے
متنفر رہا ہو اور عامہ مسلمین کو بھی ایسی ہی ہدایت کرتا ہو۔ کہیں نہیں سُنا ہوگا کہ کسی لالچی حریص
سگِ دُنیا کو کسی زمانے میں بزرگ یا مقتدائے وقت مانا ہو۔ یہ دوسری بات ہی کہ کسی نے ٹٹّی
کی آڑ میں شکار کھیلا ہو لیکن ایسے شکاری کی بزرگی چار دن کی چاندنی رہی ہی۔ مرنے کے بعد
تو کیا زندگی ہی میں اُسکا راز فاش ہو گیا ہی اور بڑی ذلّت اور رسوائی کی موت سے مرا ہی۔
سو ایسے دشمنانِ امت سے ہماری غرض نہیں ہی۔ ہمارا منشا صرف اُن بزرگوں کے ذکر سے ہی
جو ہمیشہ متحد القلب واللسان رہے ہیں جنکا قال حال کے موافق اور حال قال کے مطابق رہا
ہی۔ جنھوں نے دُنیا کی زیب و زینت کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ جنھوں نے کبھی اسکی سُریلی گتوں
پر کان نہیں دھرا۔ جنھوں نے کبھی حب مال وجاہ میں صراط مستقیم سے لغزش نہیں کھائی۔ اور جو عمر
بھر اتباع نبوی میں ثابت قدم رہکر ما انا علیہ و اصحابی کے مصداق رہے۔ با ایں ہمہ جس زمانے
میں ایسے نفوس مقدسہ کی جماعت زیادہ ہوئی ہی وہی زمانہ خیر و برکت۔ اسلام کی قوت۔ اور
مسلمانوں کی ترقی کا سمجھا گیا ہی۔ اور اسکی خاص وجہ یہ ہی کہ مسلمانوں کو حب دُنیا سے روکا
گیا ہی۔ کسبِ دُنیا کی ممانعت نہیں کی گئی۔ چنانچہ حدیث کے بھی الفاظ یہی ہیں کہ حب الدنیا راس
کل خطیئۃ تو جب مسلمان حب دنیا میں مبتلا ہو کر اس بدترین خطا کے مرتکب ہوئے میں ہمیشہ ذلت و خواری نصیب ہوئی ہی اور جب
محض قوت لایموت کی غرض سے کسب دنیا کیطرف معمولی توجہ کی ہی خود بخود وہ نمایاں ترقی ہوئی ہی کہ دوسری قومیں سر پٹک کر بیٹھ رہیں
لیکن اس درجہ تک نہیں پہنچ سکیں غرضکہ جتنا چاہیں غور کریں حکومت سلطنت تک فی نفسہا اسلام میں
مذموم نہیں سمجھی گئیں۔ بلکہ اِن کی محبت کو حرام اور گناہ کبیرہ بتلایا گیا ہی سید احمد خاں کے ظہور
کے وقت علماء کیجانب سے جو مخالفت ہوئی اُس کا یہ سبب تو ظاہر ہی تھا کہ سید صاحب نے
عقاید میں دخل دیا۔ اصول قدیمہ متفق علیہا میں ترمیم کی۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اِس

مخالفت پر جوش دلانیوالا سید صاحب کا مسلمانوں کو ایک حرام چیز یعنی حبِّ دنیا کی تعلیم دینا تھا - کیونکہ صرف عقائد میں دخل دینے والے لوگ ان سے پہلے بھی بہت سے گذر چکے ہیں مگر چونکہ انہوں نے کسی قسم کا دنیوی لالچ نہیں دیا اس لیئے اُن سے ایسی عظیم الشان مخالفت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی - لیکن جس وقت سید صاحب نے نہایت بلند آواز سے قوم قوم پکارنا شروع کیا - علمار اس آواز کے سُنتے ہی کھٹک گئے کہ بس اب اسلام کی خیر نہیں ہے - جو شخص کہ فاسد عقیدے رکھتا ہو امسلمانوں کے ساتھ قومی ہمدردی کا بھی اظہار کرتا ہو ضرور ہے کہ اسکا اثر پڑے اور بہر پڑے - اسلیئے اُسکی ہمردی کرنے میں عقاید و اعمال دونوں کی جوکھوں سمجھ کر جو کچھ بھی مخالفت[1] کیگئی وہ کون نہیں جانتا - ہر طرف سے کفر کے فتوے مشاہیر علمار کی مُہروں سے مزین ہو کر شائع ہوئے اخباروں رسالوں کے ذریعہ سے لعنت ملامت کی بوچھار الگ کیگئی - غرضکہ اُسکے شر سے محفوظ رکھنے کے لیئے جو جو طریقے مناسب معلوم ہوئے اُنمیں کوئی بھی کسر نہیں رکھی گئی - یہ حکایت بھی اُسی وقت کی ہے کہ ایک مرتبہ سید صاحب اسٹیشن پر ریل کے انتظار میں ٹہل رہے تھے - ایک شخص آیا - اور کہنے لگا کہ سید صاحب آپ شیطان کے مُنکر ہیں آیئے میں آپ کو شیطان دکھاتا ہوں - یہ کہکر سید صاحب کا ہاتھ پکڑا اور ایک بہت بڑے آئینے کے پاس لیجا کر کھڑا کر دیا اور خود پیچھے کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ دیکھیے سید صاحب وہ رہا شیطان - سید صاحب نے جب آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو بہت کھسیانے اور شرمندہ[2] ہوئے - کانفرنس کا سالانہ اجلاس کسی شہر میں ہونے کو تو ہو جاتا تھا لیکن پھر سال بھر تک اُسکی خوب ہی روئی دھنکی جاتی تھی - دسمبر ۱۸۹۲ء کے اجلاس دہلی میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے ایک قصیدہ سید صاحب کی تعریف میں پڑھا - میاں قدسی صاحب ایڈیٹر صادق الاخبار بہاولپور نے اُسپر ایسا حاشیہ چڑھایا کہ بایدو شاید ہمیں یہ حاشیہ چونکہ خود بھی پسند ہے اور دوسروں کی زبانی

---

[1] خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے اس مخالفت کو نہایت تفصیل کیساتھ لکھا ہے اگرچہ پیرایہ دوسرا ہے اور منشا کچھ اور ہے ۱۲

[2] افسوس ہے کہ کالج میں تو کوئی ایسی صورت بھی نظر نہیں پڑتی ۱۲

بھی اسکی تعریف سنی ہی اسلیئے اس موقع پر بھی اسکا درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا-

م سے مراد مولوی صاحب

ق سے مراد قدسی صاحب

ڈپٹی مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کا قصیدہ مدحیہ اور میاں قدسی صاحب کا پُر لطف حاشیہ

م	وہ بیمار قریب مرگ ہی اسلام واویلا	مسیحا کو نہیں ہی جسکی امید شفا باقی
ق	مسیحا خود نہ ہوں بیمار شک ہی مولوی صاحب	ہوا پریشن تو جانیں وضع کیا ہوتا ہی کیا باقی
م	مسیحا کون سر سید[1] پکارے سب میں کہتا ہوں	صدوی سال اسکو اور رکھیو اے خدا باقی
ق	تو یوں کہیئے کہ حضرت[2] ہر ملاب آگئے رجل میں	یہی تھا آپکے ترکش میں اک تیر قضا باقی
	اکیلا جی کے سر سید کریگا سو برس تک کیا	بڑھاوا دینے والا بھی تو کوئی رکھیگا باقی
	نذیر احمد بھی نفخ صور تک یا رب جئیں جاگیں	سیمٹیں اور نہ رکھیں حشر کا اک بوریا باقی
م	بھلا ہی یا برا یہ جانے یا اسکا خدا جانے	مگر ہی کوئی اسکی شان کا اسکے سوا باقی
ق	خدا کی شان اسکی شان پر ہی آپکو حیرت	نہ جسنے شان میں اسلام کو رہنے دیا باقی
	بھلا ہی یا برا یہ جانے - کہدو پر یہ کہدینا	رہیگا نامہ اعمال میں لکھا ہوا باقی
	خوشامد میں یہ بھولا پن تملق میں ڈھول ایسا	نہ رکھا آپنے انجان بنکر کچھ لگا باقی
	خدانے آپکو معیار علم و فضل بخشا ہی	نہیں رہتا ہی آکر ہاتھ میں کھوٹا کھرا باقی
	تو ایسے شمع جمع زر کے کیوں پروانہ بنتے ہو	جلا کر راکھ کردے گر رہے اک کوئلا باقی
	ابھی سے ڈگ گئے یا رب ہمارے مولوی صاحب	ابھی دو چار جلسوں تک تو رکھتے حوصلا باقی
م	عقائد میں کسی کے دخل دینے کی ضرورت کیا	قیامت کو بھی رہنے دوگے کوئی فیصلا باقی

[1] ہمارے نزدیک سر سید کو مسیحا سے تشبیہ دینا ہی فضول تھا کیونکہ سر سید سرے سے حضرت مسیح علیہ السلام ہی میں اس معجزے کے قائل نہ تھے ۱۲

[2] مولوی نذیر احمد صاحب کی دعا تو سر سید کے حق میں قبول نہ ہوئی لیکن قدسی کی دعا ان کے حق میں قبول ہوتی معلوم ہوتی ہے ۱۲

ق عقائد میں دیا ہی دخل کسنے خود ہی فرمائیں
رکھا تفسیر میں کوئی دقیقہ بھی بھلا باقی

مفسّر اور اماموں کی کہو تضحیک کس نے کی
نہ چھوڑا انبیاء کے پاس کسنے معجزا باقی

کہا کسنے کہ ہیں احیائے موتی کا نہیں قائل
کہا کسنے نہیں رکھتا اجابت اور دعا باقی

کہا کسنے اگر جیتے رسول اللہ کچھ دن اور
نہ رکھتے خانہ کعبہ کا جہاں میں پھر پتا باقی

کہا کسنے نہیں ہی آسماں پر اک فرشتہ بھی
کہا کسنے نہیں جنات ہی اک وہم سا باقی

کہا کسنے کہ روح اللہ بیشک باپ والے ہیں
کہا کسنے کہ ہی گردن مروڑی میں مزا باقی

ذرا اس سے تو بیباقی کرائی ہوتی حضرت نے
جبھی کہتے کہ خودسر ہو تمہیں پر ہے خطا باقی

م یہی اک فرد اکمل ہی کہ جس کو دیکھ کر جانا
ہماری ناؤ کا ابتک ہی بارے ناخدا باقی

ق چلا کر ناؤ کاغذ کی یہ فرماؤ تو فرماؤ
ہماری ناؤ کا ابتک ہی بارے ناخدا باقی

مگر وہ ناؤ جس کو نوحؑ کی کشتی سے نسبت ہے
حوادث سے بچا کر اسکو رکھنا یا خدا باقی

م جزاک اللہ خیرا قوم کی اصلاح حالت میں
دقیقہ ایک بھی تو نے نہیں رکھا اٹھا باقی

ق بٹھایا قوم کی گدی پر اُسنے اپنے بیٹے کو
دقیقہ ایک بھی اُسنے نہیں رکّھا اٹھا باقی

تمھیں ترغیب دے دے کر سگِ دُنیا بنا ڈالا
نہیں رکھّی تمہارے دلمیں حبِّ کبریا باقی

اگر کچھ مال و زر تھا جیب میں کالج میں کھو بیٹھے
نہ چھوڑا اسکو بھی ہی لبپہ جو لفظ مرحبا باقی

م خدا نے تجکو پہونچایا ہی اُن اعلےٰ مراتب پر
فزوں تر جس سے اب کوئی نہیں ہی مرتبا باقی

طریقِ مختصر پہ گر ترے القاب یکجا ہوں
تو مشکل ہے کہ ابجد میں رہے حرف ہجا باقی

ق دکھائی بلیں تو ایسی شاعری کلکِ ثناگر نے
کہ مضموں بندِ عالم اب ہیں بے برگ و نوا باقی

اُڑایا حضرتِ حالی کا حصّہ بھی قیامت کو
حساب اپنا وہ دکھلائینگے کیا نکلا ہوا باقی

م مگر معلوم ہی تجکو مسرّت کچھ نہیں اسکی
کہ تو ہی دردمند قوم اور تیرا گلا باقی

ق مسرّت گر نہ ہوتی تو وہ ٹھٹھری میں آتے کیوں
کہ ہی اسٹیج کے گانے کی اُنکی اک صدا باقی

م محالِ عقل ہی تجکو ہوا اس دنیائے فانی میں
سوا از قوم کوئی آرزو یا التجا باقی

ق محال عقل ہی چھوٹ جائے اُس سے زوال دنیا ہے — ہی باغِ زندگی میں جبتک اُسکے کچھ ہوا باقی

م نہو بیدل اور اپنی ہی کیے جا صرف ہمت بس — کہ سب کے سرپہ اب تو ہی ہی اک بوڑھا بڑا باقی

ق گلیڈاسٹون صاحب کو بھی گن جائے تو اچھا تھا — کہ وہ بوڑھوں کے سرپر بھی ہی اک بوڑھا بڑا باقی

م اگر انعام کی تجکو توقع ہے تو باور رکھ — خدا کے پاس ہی تیری جزا تیرا صلا باقی

ق خدا کے پاس سے ملنے کی امیدیں تو رہنے دو — نہیں حصہ وہاں دنیا پرستوں کا ذرا باقی

م تجھے روئیگی سرپر ہاتھ رکھکر قوم بدقسمت — اور اسکو دیکھ لیگا جو کوئی جیتا رہا باقی

ق تمھاری جان کو روئیگی یوں کہنا مناسب تھا — مگر بھولے سے مولانا یہ تمسے رہ گیا باقی

م نہوویں کارگر گر لاکھ تدبیریں تو پرواکیا — ابھی سب سے بڑی باقی ہی تدبیرِ دعا باقی

ق اُٹھا رکھیے دعا کو آزمایا اسکے منکر ہیں — مگر لا دوشفاخانے سے گر ہو کچھ دوا باقی

مگر یہ سب کچھ سید احمد خاں کی زندگی ہی تک تھا۔ سید احمد خاں کا انتقال ہوتے ہی سب نے قلم رکھے فتوے داخلِ دفتر کیے گئے۔ علما، یہ سمجھ کر کہ خس کم جہاں پاک بیفکر ہو بیٹھے۔ مگر سید احمد خاں نے اپنے حواری کو جس کام پر لگا دیا تھا وہ اُسکو اُسی طرح مستعدی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ کانفرنس کا اجلاس بڑے آب و تاب کے ساتھ ہوتا رہا۔ سید احمد خاں کی تصانیف مذہبی (تفسیر القرآن وغیرہ) کی اشاعت میں بھی کمی نہیں کیگئی۔ اور جب دو چار برس کے بعد یہ دیکھا کہ کفر کے فتوے بوسیدہ ہو گئے ہیں۔ جو علمار وقت ہیں وہ عالمِ خموشاں میں ہیں اَور بھی حوصلے بڑھنے لگے۔ اب کیا تھا کھُلے خزانے علمار کو بُرا بھلا کہا جانے لگا سید احمد خاں کی مخالفت کا جو غبار دلوں میں بھرا ہوا تھا وہ خوب ہی تو نکالا۔ چھُٹ بھیّے مولویوں نے جب کالج کا پالا بڑھتا دیکھا تو یہ بھی عالی حوصلہ خیر خواہِ قوم کہلانے کی غرض سے آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ کسی نے سالانہ امتحان پر علیگڈھ پہونچنے کا ڈھنگ ڈالا۔ کسی نے قومی مضامین کی مشق کرکے کانفرنس میں وقت لینا شروع کیا کسی نے سید احمد خاں کی برسی میں فاتحہ خوانی کی خدمت بڑے فخر سے قبول کی عوام الناس کا کیا قصور۔ یہ یا تو مولویوں سے سُنی ہوئی کہا کرتے ہیں یا اخباروں کی دیکھی جب ان دونوں نے

دوکانداری اور نام و نمود کی خواہش سے اپنا رویہ بدل دیا یہ بیچارے بھی اُنہیں کی چال چلنے لگے
جہاں کہیں کوٹ پتلون کیساتھ جُبّہ قلہ نظر آیا پیچھے پیچھے آپ بھی ہو لیے۔ غرضکہ اسی طرح اہل کالج
کا رعب و داب ہندوستان پر بیٹھ گیا۔ اور اب تو یہاں تک نوبت پُہنچ گئی ہی کہ بڑے بڑے
علمار کالج ہی کا دم بھرتے ہیں۔ دنیا پرستی ایک مذہب ہوگیا ہی۔ دنیا پرستوں کو مقتدا و پیشوا
مان لیا ہی۔ جو آجتک حمایت اسلام و ہدایت اسلام پر مستعد نظر آتے تھے یونیورسٹی کی تحریک
نے سب کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ جسکو دیکھیئے یونیورسٹی کے چندہ میں کچھ اسطرح کوشش کر رہا ہی
جس سے معلوم ہوتا ہی کہ گویا یونیوسٹی دین و دُنیا کی نجات کرادیگی۔ جس شیخ حلقہ کے پاس
کوئی کوٹ پتلون جا پہنچا دیکھتے ہی جو کچھ جیب میں ہوا وہ نہایت ادب کے ساتھ نکالکر سامنے
رکھدیا۔ اور اہلِ سلسلہ کے نام ایک گشتی پروانہ جاری کردیا کہ جسطرح ہوسکے دامے درمے قدمے
سخنے یونیورسٹی میں مدد دو۔ کسی کوٹ پتلون کو خالی جیب واپس نہ کرو۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جاتا
ہی تو آجتک جو کچھ اہلِ کالج نے ہمت صرف کی ہی وہ محض ان علمار کے نیست و نابود کرنے میں کی ہی
علمار کی جانب سے خواہ کسی قسم کا خلاف ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن یہ برابر اسی فکر میں رہے ہیں کہ جہانتک
ہوسکے ان مُلّاؤں کی بیخ بنیاد نکالکر پھینکدی جاوے۔ متعصب۔ زاہد خشک۔ تنگ خیال پست
حوصلہ۔ قوم کو غارت کرنے والے۔ قوم کو تباہ و برباد کرنے والے۔ یہ تمام معزز خطابات علمار کو
کالج ہی کی طرف سے عنایت ہوئے ہیں اودھ پنچ بنارس گو ایک نہایت چھچورا اور اسلامی
تہذیب سے گرا ہوا پرچہ ہی۔ مگر وہ بھی کسی نہ کسی مضمون میں دو چار سُنا ہی جاتا ہی۔ غرضکہ اس
گروہ کا ادنےٰ اعلیٰ کسی لیاقت کا جنٹلمین کیوں نہ ہو علمار کو دشمن قوم ہی سمجھتا ہی۔ مگر معلوم نہیں
علمار کو کیا خوشامد ہی کہ اُنکو اہل کالج سے بہتر کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ خیر اب ہم زیادہ تو نہیں اتنا
جتا نا تو ضروری سمجھتے ہیں کہ اب تک تو معمولی مسائل کے اختلاف سے آپس میں ایک دوسرے
کو وہابی۔ بدعتی۔ کہا جاتا تھا مگر اب دیکھتے جایئے صاحبانِ علیگ مار آستین بنکر سارا قصہ ہی
طے کیئے دیتے ہیں۔ یہ نہ مذہب چھوڑینگے۔ نہ مذہبی اختلاف۔

علماء کی ایک جماعت اہلحدیث کہلاتی ہی - اس طرف اگر نظر ڈالی جاتی ہی تو ایک عجیب قسم کا نظارہ آنکھوں کے سامنے آتا ہی - اصل یہ ہی کہ اس جماعت نے تو بالکل لٹیا ہی ڈبو دی ہی - خوب تجربہ ہوگیا ہی کہ ان کا تو محض دعویٰ ہی دعویٰ ہی - ان میں جاہل سے جاہل بھی پابند شریعت متبع سنت ہونے کا دم بھرتا ہی - مگر معلوم نہیں اتباع سنت کے کیا معنی سمجھ رکھے ہیں - کیا نماز میں ٹانگیں چوڑا کر کھڑا ہونے - آمین کی آواز سے مسجد کو گونجا دینے کو اتباع سنت کہتے ہیں؟ - نہیں بلکہ اتباع سنت یہ ہی کہ مسجد کے اندر ہوں یا مسجد سے باہر - تمام اقوال افعال حرکات - سکنات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں - ہر وقت یہی کوشش رہے کہ کوئی فعل - کوئی قول رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہ ہونے - مگر یہاں یہ کیفیت ہے کہ ڈاڑھی منڈھی ہوئی ہی اور کہنے کو بڑے زور سے اہلحدیث ہیں کسی مسئلے کا اگر ذکر آجائے تو دس بیس حدیثیں غلط سلط فوراً سنا دیں - زیادہ حجت ہو تو امام ابو حنیفہ رح کی غلطی ثابت کرنے پر مستعد ہو جائیں -

سنگدلی - ہٹ دھرمی انمیں اس درجہ ہوتی ہی کہ اپنے سامنے بزرگان دین کی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتے - مگر یہ اس حالت پر کچھ دنوں رہ کر آخر خود بھی گمراہ ہو جاتے ہیں اور نیچری چکڑالوی وغیرہ بنکر دوسروں کو بھی گمراہ کیا کرتے ہیں - اگرچہ اس جماعت کے مایہ ناز مولوی ثناء اللہ صاحب نے اسکا[1] جواب دینے میں بہت زور لگایا ہی مگر نہیں دے سکے آپ بات بات پر یہ تو لکھدیتے ہیں کہ سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست - مگر میں کہتا ہوں کہ سخن شناسی غیر مقلدوں کا حصہ ہی نہیں - میرے نزدیک غیر مقلد بنتا ہی وہ ہی جسمیں سخن شناسی کا مادہ نہ ہو - آپنے اسکو عوام کا مقولہ سمجھا ہی - لیکن درحقیقت یہ خواص کا ہی - اور واقعات کی رو سے بالکل سچا اور بجا ہی - آپنے یہ تو لکھدیا کہ اگر ہم بھی فرض کریں کہ یہ لوگ (نیچری وغیرہ) پہلے پکے اہلحدیث تھے اور بعد میں ترقی کرکے اس حد تک پہونچے ہیں تو پھر بھی یہ الزام اہلحدیث کے مذہب پر نہیں - کیونکہ اس حالت پر اگر وہ پہنچے ہیں تو اہلحدیث کے مذہب کو چھوڑ کر پہنچے ہیں"

[1] یعنی اسکا کہ غیر مقلدی سے نیچری - چکڑالوی بنتے ہیں - دیکھو تقلید شخصی صفحہ اخیر ۱۲

لیکن یہ خیال نہ فرمایا کہ غیر مقلدی خود یہ مذہب چھوڑ اگر اس حالت پر پہونچا دیتی ہے۔ ارادہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور وجہ اسکی یہ ہے کہ غیر مقلدی انسان کو بے ادب۔ گستاخ بنا دیتی ہے۔ غیر مقلد اپنے لیے نہ کسی مجتہد امام کی ضرورت سمجھتا ہے اور نہ اُسکے دلمیں کسی کی کچھ عظمت و وقعت ہوتی ہے۔ وہ آپ کو سرکشی اور خود رائی سے علامۂ عصر مجتہد وقت خیال کرکے ائمۂ دین کی تضحیک کیا کرتا ہے۔ تو جو شخص آج ائمۂ دین کو اس بے وقعتی اور حقارت سے دیکھ رہا ہے ضرور ہے کہ اِس خبیث طینت میں ترقی کرکے ایک روز نبی کریم (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کی تحقیر و اہانت پر بھی مستعد ہو جاویگا۔ چنانچہ سید احمد خاں کی ترقی کا یہی راز ہے۔ اور جانے دیجیے۔ سید احمد خاں کو آپ ذرا اپنے ہی گریبان میں مُنہ ڈالکر دیکھیے ایک روز تو آپ کا یہ دعویٰ تھا کہ " اہلحدیث ہی کی تحریک سے لوگ حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اور ہندوستان میں بفضلہ تعالےٰ کہیں کہیں درس حدیث کی آواز آنے ہی لگی تھی کہ ناگاہ علیگڈھ سے ایک طوفان بے تمیزی کھڑا ہو گیا یعنی سر سید احمد خاں نے حدیث کی نسبت اپنے خیالات منکرانہ شائع کیے۔ اُسوقت اہلحدیث ہی اُس ہنگامے کے مٹانے کو سینہ سپر ہوئے"۔[1] یا آج یہ حال ہے کہ اُسی منکر حدیث کے پیرووں کی ثناگوئی میں آپ رطب اللسان رہتے ہیں۔ اخبار میں پہلے اُنکا ذکر خیر کرکے پھر اور مضامین درج کرتے ہیں۔ کیوں۔ کہاں گیا وہ دعویٰ۔ اور کہاں گئی وہ سینہ سپری۔ کیا اِسی پر اپنے آپ کو اُن بزرگان اہلحدیث رحمہم اللہ تعالےٰ میں داخل کرنا چاہتے ہو جن کی برکت اور حسن سعی سے ہندوستان میں درس حدیث جاری ہوا۔ سچ کہتے ہیں ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور بارہ مصلحے کے مزے اُڑانا۔ اور اہلحدیث کہلانا۔ مگر ہم آپ کو اس میں مجبور محض سمجھتے ہیں۔ کیونکہ غیر مقلدی (جسکو مطلق العنانی بھی کہہ سکتے ہیں) کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہنے دیتی بہت سی خصلتیں اُن لوگوں کی آپ میں بھی آچلی ہیں۔ وضع تراش میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے خود نمائی۔ خود پسندی جو نیچریت کا خاصہ ہے آپ میں اسکی بھی کچھ کمی نہیں ہے۔ مگر اب بھی کچھ

[1] دیکھو پیام حربت نبوی ۱۲

[1] ہم اسکا زبردست ثبوت آپکی تحریرات سے دے سکتے ہیں جسمیں کسی مزید تشریح یا حاشیہ کی ضرورت نہ ہوگی ۱۲

نہیں گیا۔ آپ سنبھلیں اور خیالات کی اصلاح کریں۔ اور اگر خدانخواستہ کچھ دنوں یہی حالت رہی تو یاد رکھیے کہ آپ بہت جلد بجائے مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے مولوی ثناء اللہ نیچری مشہور ہو جاوینگے۔ وما علینا الا البلاغ۔

ایک بات یہ سمجھ میں نہیں آئی کہ جب سب جانتے ہیں کہ یہ گروہ نہ مذہب کی قدر کرتا ہے نہ علماء و صلحاء کی توقیر ان کے دلوں میں ہے۔ پھر کیوں سب کے سب اِن کے دل و جان سے شیدائی بنے ہیں۔ کیا انکو احکام شرعیہ کا مکلف نہیں سمجھتے۔ کیا وعدہ وعید میں یہ لوگ مخاطب نہیں ہیں البتہ اگر کوئی حدیث اِس مضمون کی ہمیں بھی معلوم ہو جائے کہ ایک زمانہ میں ایک گروہ پیدا ہوگا جو مدعی اسلام ہوگا اور مسلمانوں کی ہمدردی کا بھی دم بھرتا ہوگا۔ مگر نہ وہ پابند مذہب ہوگا نہ پابندی مذہب کی اُسکو ضرورت ہوگی تو ہم بھی بے تامل انکو تکالیف شرعیہ سے بَری اور مستثنےٰ سمجھ کر گلہ شکایت چھوڑ دیں مگر یہ مضمون نہ کہیں نکل سکتا ہے اور نہ کوئی دکھا سکتا ہے یہ سب اسلام کی قسمت ہے کہ علماء بھی اِن دُنیا پرستوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں۔ جسوقت شروع سال میں یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی تو مجھے یہ خیال ہوا کہ جیسے مذہبی حلقوں میں آجتک کالج کو مخرب اسلام سمجھا گیا ہے ضرور ہے کسی نہ کسی گوشے سے یونیورسٹی کی اصلیت بھی مسلمانوں کو جتائی جائیگی مگر یہ مجوزان یونیورسٹی کی حکمت عملی ہے کہ یونیورسٹی کے دیگر مقاصد بیان کرنے سے پہلے مذہبی تعلیم کا ذکر نہایت شد و مد سے کر کے ایسا جھمہ دیا کہ کسی کو خلاف کرنے کی جرأت ہی نہ ہوسکی۔ غرضکہ اِس انتظار میں ایک ششماہی گزر گئی جب یہ یقین کامل ہوگیا کہ بس اب مجوزان یونیورسٹی کا جادو پوری طرح اثر کر گیا ہے جو موافق ہیں وہ سرگرم کوشاں ہیں۔ اور جو دو ایک مخالف ہیں وہ ساکت ہیں۔ مجبوراً اِس اہم کام کو اپنے ذمہ لیا مگر ناظرین آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ جب سید احمد خاں کے ظہور کے وقت چاروں طرف سے دفعۃً مخالفت کا جھنڈا بلند ہوا تھا تو اُس عالمگیر مخالفت کے وقت کسی کا مخالف بننا کوئی ہمت کا کام نہ تھا۔ اُسوقت تو یہ کیفیت تھی کہ جنے انگلی کٹا کر شہیدوں میں شریک ہونا چاہا اُسی نے سید احمد خاں کو دو چار سلواتیں سُنادیں۔ کافر ملعون

ملحد مرتد کہہ دیا۔ زیادہ جوش آیا قتل کی دھمکی دے بیٹھا۔ لیکن اس زمانے میں بقول فدائیانِ قوم سرسید کی قومی ہمدردی مسلم ہو چکی ہی (اور قومی ہمدردی کے ساتھ پکا مسلمان بھی مان لیا گیا ہی) تو جو کام اُسوقت لڑکوں کا کھیل تھا آج ایک مرد میدان سے بھی اسکی توقع محال ہو گئی ہی۔ حجرہ میں بیٹھا ہوا جسکا جو جی چاہے کہے جائے۔ لیکن یہ مجال اور حوصلہ نہیں رہا کہ باہر نکلکر بھی یہ صدا بلند کر سکے۔ اگر ارادہ بھی کرے تو در و دیوار تک منہ بند کرنے اور گلا دبانے کو تیار ہو جائیں تو اب اُسکا بھی اندازہ کر لیجئے کہ مرا یہ راگ چھیڑنا کیسا خلاف مصلحت اور بے وقت معلوم ہوگا ہر طرف یگانے و بیگانے مجھ پر داستانیں ہنسیں گے۔ کوئی دشمن قوم کہیگا کوئی دشمن اسلام۔ مگر میں نے پہلے ہی یہ خیال کر کے کہ جب آجتک کسی ضال و مبتدع کو اپنے خیالات باطلہ ظاہر کرنے میں کسی مخالفت کی پرواہ نہیں ہوئی تو حق کے اظہار میں کیوں کسی خیال سے دریغ کیا جائے۔ تمام دھڑکے دل سے نکال ڈالے اور نہایت جرأت کے ساتھ اِس نتیجہ پر پہونچگیا کہ اگر یہ سال اسی طرح کسی کی تائید کسی کے سکوت میں گذر گیا تو پھر اہل یونیورسٹی اسلام کیساتھ کیسا ہی سلوک کیوں نہ کریں کسی کو ذرا [illegible]ف کرنے کا موقع نہیں رہیگا۔ سید احمد خاں کو اسوقت تک تو محض دنیوی مصلح ہی سمجھتے ہیں لیکن خواب کی تعبیر پوری ہونے پر وہ بالاتفاق مجدد ولی صاحب کرامت تسلیم ہو جائیگا۔ پس اس خیال سے یہ ارادہ کیا کہ جسنے یہ خواب دیکھا ہی جسکے نام کے ساتھ مرحوم مغفور لکھا جاتا ہی ذرا اُسکے عقیدے بھی تو مسلمانوں کو دکھا دوں۔ ورنہ اگر یہی بے خبری رہی تو جو کچھ تھوڑی بہت مخالفت کسی وقت ہوئی بھی تھی اُسکو محض بے بنیاد سمجھیں گے اور یہ سارا الزام علمار دین یا بالفاظ دیگر مسجد کے مُلاؤں کے ذمہ رکھدیا جائیگا کسی کو وہم تک بھی نہ ہوگا کہ سید احمد خاں نے مذہب میں کیا دست اندازی کی ہی مسلمانوں کو کیسے فاسد عقیدے تعلیم کئے ہیں۔ علمار مفسرین کی کیسی تضحیک کی ہی۔ انبیاء علیہم السلام کی نسبت کیسے خیالات ظاہر کئے ہیں کیونکہ اسوقت بہت سے مسلمان ایسے ہیں جنکو بوجہ عدم استطاعت یا عدم فرصت سید صاحب کی تصانیف دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور جو کچھ اُنہوں نے سُنا ہی وہ سب

ملاؤں کی گھڑنت ہی سمجھتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ جو ہوش سنبھالتے ہی کالج کا عروج دیکھکر
لٹو ہو گئے اور اُس کے بانی کے خیالات کی طرف ذرا توجہ نہیں کی اور اسکے ساتھ ہی ایک
خیال یہ ہوا کہ جو لوگ کھلم کھلا اسلام کے دشمن بنکر اسلام کو نقصان پہونچانے کی فکر میں ہیں
اُن کو تو ہر ادنے اعلیٰ مسلمان بُرا سمجھتا ہی ہی لیکن جو دوستی کا دم بھرتے ہوئے اسلام کو صفحۂ
ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں اُن کی گہری اور زہریلی چالوں پر کوئی نظر نہیں کرتا۔ جسکو دیکھیے
اِن اصطلاحی ہمدردوں کی چکنی چُپڑی باتوں پر آپے سے باہر ہوا جاتا ہی کوئی انکو فدائیِ
قوم کہتا ہی۔ کوئی فنائی القوم۔ لیکن اسکی کوئی انتہا بھی ہی۔ عنقریب یہ راز فاش ہوا چاہتا
ہی ہمارے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی ہر شخص خود ہی منصف اور خود ہی مفتی بنکر انکی ہمدردی
اور خدماتِ قومی کا سچا اور صحیح فیصلہ کرلیگا۔
غرضکہ ناظرین میں نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر سید احمد خاں کی تفسیر اُٹھائی اور اُسمیں سے
اُن خاص خاص آیتوں کی تفسیر جسمیں سید صاحب نے اپنی بڑ سب سے الگ ہانکی ہی ایک جگہ انتخاب
کی۔ اور ساتھ کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک جو اُس مقام کے مناسب
تھی اور علماء مفسّرین کی متفق علیہ تفسیر نقل کردی ہی اور نام اسکا سر سید کا اسلام رکھدیا
اگرچہ عام طور پر یہ خیال ہوگا کہ سید احمد خاں کے اقوال و عقائد کی تردید دلائل عقلیہ سے
ہونی چاہیئے تھی لیکن ہم نے اِس طرف ذرا توجہ نہیں کی۔ اور نہ کرنے کی معقول وجہ ہی۔ وہ یہ کہ
ہمیشہ دلائل عقلیہ سے اُسکے مقابلہ پر کام لیا جاتا ہی جو اپنے آپ کو کھلم کھلا منکر قرآن و
حدیث ظاہر کرتا ہو اور اہل اسلام میں سے ایک فرد کو بھی اُسکے ظاہر و باطن مسلمان ہونے
کا یقین نہ ہو تو ایسے شخص کے لیئے آیت و حدیث پیش کرنا کبھی باعث تسکین نہیں ہو سکتا
بلکہ اُسکے اطمینان کے لیئے ہر مسئلہ پر دلیل عقلی سے کام لیا جائیگا اور یہاں قصہ یہ ٹھیرا کہ
سید احمد خاں خود بھی بڑے دعوے کیساتھ اپنے آپ کو سچا اور پکا مسلمان سمجھتے تھے۔ اور
اسوقت مسلمانوں کا اکثر حصّہ اُن کو مسلمان تسلیم کرتا ہی اسلیئے ہم نے بھی اُنکو مومن باللہ والرسول

ہی فرض کر کے ہر قول کی تردید قال اللہ وقال الرسول سے کردی ہی جسکو دیکھ کر ہر مسلمان نہایت آسانی سے یہ معلوم کر سکتا ہی کہ سید احمد خاں یہ کہتے ہیں اور اللہ و رسول کا یہ حکم ہی - اللہ اللہ خیر سلا - لیکن ہم آپ کو اصل مضمون دکھانے سے پہلے دو خط نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علیخاں سابق آنریری سکرٹیری کالج علیگڈہ کے بنام سید احمد خاں دربارہ تفسیر سُناتے ہیں تاکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہوجائے کہ نواب صاحب کالج میں آنے سے پہلے سید صاحب کی تفسیر کے متعلق کیا خیال رکھتے تھے -

پہلا خط

حیدر آباد دکن
۹ اگست سنہ ۱۸۹۲ء

جنابعالی

آجکل میں آپ کی تفسیر دیکھ رہا ہوں جسے درحقیقت ابتک اچھی طرح بلکہ سرسری طور پر بھی نہیں دیکھا تھا - اور اُس کے نہ دیکھنے کا سبب آپ سے کہہ بھی دیا تھا - غالباً آپ اس بات کے سُننے سے تو خوش نہ ہونگے کہ میں اب تک آپ کی رایوں سے اتفاق نہیں کرتا اور ہر بحث میں اُسے قرآن کی وہ تفسیر جسکو کوئی قرآن کے مطالب کی تشریح اور تفصیل اور تفسیر سمجھے نہیں سمجھتا - بلکہ اکثر جگہ تفسیر کو تفسیر القول بمالا یرضی بہ قائلہ تصور کرتا ہوں - مگر اسمیں شبہ نہیں ہی کہ جس مضمون کو آپنے لکھا ہی ایسی عمدگی اور صفائی سے بیان کیا ہی کہ اگر آدمی نہایت ہی راسخ الاعتقاد نہ ہو تو ضرور اُسکی تصدیق کرنے لگے اور بلاشبہ ایک جادو کیے ہوئے آدمی کی طرح آمنا وصدقنا پکارنے لگے - واقعی خدانے دل کے حالات کو الفاظ میں ادا کرنے اور تحریر میں لانے کی عجیب حیرت انگیز قوت اور طاقت آپ کو دی ہی کہ اگر اُسے جادو کہیں یا سحر تو بے محل نہ ہو - مگر افسوس ہی کہ آپ نے اُن مسائل کو جو آجکل یورپ کے وہ تعلیم یافتہ لوگ جو مذہب کے پورے پابند اور معتقد نہیں ہیں صحیح اور یقینی اور غیر قابل الاعتراض سمجھتے ہیں مان لیا ہی اور قرآن کی آیتوں کو جن میں اُن کا ذکر ہی ایسا ماوّل کردیا کہ وہ تاویل ایسے درجہ پر پہونچگئی کہ اُسپر تاویل کا لفظ بھی صادق نہیں ہوسکتا - آپنے مسلمان مفسّروں کو تو

خوب گالیاں دیں اور بُرا بھلا کہا اور یہودیوں کا مقلد بنایا مگر آپنے خود اِس زمانہ کے لامذہبوں کی باتوں پر ایسا یقین کرلیا کہ اُنکو مسائل محققہ صحیحہ یقینیہ قرار دے کر تمام آیتوں کو قرآن کی ماول کر دیا اور لطف یہ ہی کہ آپ اُسے تاویل بھی نہیں کہتے (تاویل کو تو آپ کفر سمجھتے ہیں) بلکہ صحیح تفسیر اور اصلی تفسیر قرآن کی سمجھتے ہیں حالانکہ نہ سیاق کلام نہ الفاظِ قرآنی نہ محاوراتِ عرب سے اُسکی تائید ہوتی ہی اگر آپ میرے اِس شبہ کو دُور کرسکیں تو مجھے ایسی خوشی ہو کہ کسی اور چیز سے نہ ہو۔

محسن الملک

جواب از طرف سید احمد خاں

مکرمی مہدی،

میں نہایت خوش ہوں کہ آپنے میری تفسیر کو دیکھنا شروع کیا ہی مجھے نہایت خوشی ہی کہ آپ اسکو مخالفانہ اور غیر معتقدانہ طور پر دیکھیں۔ اور اُسکی ایک بات پر بھی یقین نہ کریں سب کو غلط سمجھیں۔ مگر اسکو دیکھیں اور غور سے پڑھیں۔

آپنے اِس خط میں لکھا ہی کہ اکثر جگہ تفسیر کو تفسیر القول بمالا یرضی بہ قائلہ تصور کرتا ہوں یقینی آپ کے پاس خدا کی بھیجی ہوئی وحی تو آئی نہیں جس سے آپ کو ثابت ہوا ہو کہ اِس قول سے مرضی قائل یعنی خدا کی یہ نہیں ہی پس ضرور ہی کہ کوئی اور ذریعہ آپ کے پاس ہی جسکی وجہ سے آپنے تفسیر کے مقامات کو مالا یرضی بہ قائلہ قرار دیا ہی۔ مَیں نے بہت سوچا کہ وہ ذریعہ آپ کے پاس کیا ہی۔ اور وہ ذریعے دو معلوم ہوئے۔ اول بچپن کی تربیت بچپن سے باتوں کو سُنتے سُنتے اُن کا نقش کالحجر دل میں ہو جاتا ہی۔ جس کا مٹانا بہت ہی زبردست دل اور نہایت ہی قوت ایمانیہ کا اور بہت ہی غور و فکر کا کام ہی۔ دوسرا ذریعہ جو پہلے ذریعہ کا غصبہ ہی مگر پہلے ذریعہ کو نہایت قوی اور مضبوط کرنے والا ہی وہ علماء کے اقوال اور تفاسیر کے مندرجہ رطب و یابس رواتیں اور قصے ہیں۔ گو آپنے اسی خط میں ایک فقرہ لکھا ہی کہ

میرے نزدیک یہ ساری خرابیاں غلط مذہبی خیالات اور تقلید سے پیدا ہوئی ہیں اور مسلمانوں کو اسی کمبخت تقلید نے اندھا بہرا گونگا بنا دیا ہی"۔ مگر افسوس ہی کہ تم یہ خیال نہیں کرتے کہ خود تمھارا بھی یہی خیال ہی۔ آبائی خیالات کو اور خصوصاً ایسے خیالات کو جو مذہبی روایتوں پر مبنی ہیں چھوڑنا نہایت مشکل ہی۔ آپ یہ دعویٰ نہ کریں کہ میں آبائی مذہب چھوڑ کر شیعہ سے سُنّی ہو گیا ہوں اول تو بہت سے اسباب آپکے گرد ایسے جمع تھے کہ جن کے سبب سے شیعہ مذہب نے بخوبی جڑ دل میں نہیں پکڑی تھی۔ علاوہ اسکے یہ تبدل صرف جزئیات میں تھا جو قابل اعتنا نہیں ہی۔ مگر جن امور کو آپ تفسیر القول بما لا یرضی بہ قائلہ قرار دیتے ہیں اُنکی جڑ بہت زیادہ گہری اور نہایت مضبوط دل میں بیٹھی ہوئی ہی۔ اُس کا اکھڑنا اور اسکی جگہ دوسری بات کا بیٹھنا گو کہ یہ دوسری بات کیسی ہی سچ و صحیح ہو بہت زیادہ دشوار اور بہت زیادہ مشکل ہی غرضکہ آپکے پاس کوئی دلیل اس بات کی نہیں ہی کہ آپ تفسیر کو تفسیر القول بما لا یرضی بہ قائلہ سے تعبیر کریں۔ ہاں اُسکو غلط سمجھیں اُسکو تسلیم نہ کریں یہ دوسری بات ہی۔ مگر مالا یرضی بہ قائلہ نہیں کہہ سکتے۔

آپنے اپنے خط میں لکھا ہی کہ افسوس ہی کہ آپ اُن مسائل کو جو آجکل یورپ کے وہ تعلیم یافتہ لوگ جو مذہب کے پورے پابند اور معتقد نہیں صحیح اور یقینی اور غیر قابل الاعتراض سمجھتے ہیں مان لیا ہی۔ اور قرآن کی آیتوں کو جن میں اُن مسائل کا ذکر ہی ایسا ماول کر دیا ہی کہ وہ تاویل سے ایسے درجہ کو پہونچ گئی ہی کہ اُسپر تاویل کا لفظ بھی صادق نہیں ہو سکتا۔ تمھارے اس فقرے سے مجھ خوشی بھی ہوا اور متعجب بھی ہوا۔ خوش تو اس لیئے کہ تم نے اُسپر تاویل کا صادق آنا نہیں مانا کیونکہ میں قرآن مجید میں تاویل کو مطابق اُسکے مفہوم عام کے کفر سمجھتا ہوں۔ متعجب اس لیئے ہوا کہ تم نے اس فقرے میں یہ قید کیوں لگائی ہی کہ جو مذہب کے پورے پابند اور معتقد نہیں ہیں"۔ کیا اگر کوئی لا مذہب یعنی غیر معتقد کسی مذہب کا مذاہب موجودہ میں سے یہ بات کہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں تو کیا اُسکے لا مذہب ہونے سے یہ بات

غلط ہو جاویگی - اور اگر کوئی نہایت پابند مذہب کہے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں تو کیا اُس کے پابند مذہب ہونے سے یہ بات صحیح ہو جاویگی حاشا وکلا (یہ مثال آپ کی بالکل پوچ پچر اور دھوکہ دہی پر مبنی ہی - لامذہب اور پابند مذہب کے اقوال کی اس طرح جانچ نہیں کیجاتی ۱۲ مشتاق احمد) جان من حقیقت یہ ہی کہ تم نے خدا کی عظمت کا جس عظمت کے وہ لائق ہی اور قرآن مجید کی صداقت کا جس صداقت کے وہ لائق ہی اور مذہب اسلام کی عزت اور سچائی کا جس عزت اور سچائی کے وہ لائق ہی اپنے دل پر نقش کالحجر نہیں کیا ہی - اس لیے تمہاری رائے یا تمہارا دل اور تمہارا ایمان ڈانواڈول ہوتا ہی اگر تمام خیالات کو دل سے محو کرکے یہ سچا اور دلی یقین کرلو کہ خدا سچا ہی اور قرآن اُسکا کلام اور بالکل سچا ہی تو تم کو اس قسم کے شبہات ہرگز نہ پیدا ہوں پس سمجھو کہ تفسیر لکھنے میں میرے اصول کیا ہیں اُس کے بالاستیعاب بیان کرنے کے لیئے تو ایک رسالہ مستقل چاہیئے مگر میں چند کو جو مقدم ہیں بتلاتا ہوں - پہلا اصول یہ ہی کہ خدا سچا ہی اور قرآن مجید اُسکا کلام اور بالکل سچ اور صحیح ہی کوئی علوم یعنی سچ اُسکو جھٹلا نہیں سکتا بلکہ اُسکی سچائی پر زیادہ روشنی ڈالتا ہی -

دوسرا اصول یہ ہی کہ اب ہمارے سامنے دو چیزیں موجود ہیں (۱) ورک آف گاڈ یعنی خدا کے کام (۲) ورڈ آف گاڈ یعنی خدا کا کلام یعنی قرآن مجید اور ورک آف گاڈ اور ورڈ آف گاڈ کبھی مختلف نہیں ہو سکتا اگر مختلف ہو تو ورک آف گاڈ تو موجود ہی جس سے انکار نہیں ہو سکتا اور اسلیئے ورڈ آف گاڈ جسکو کہا جاتا ہی اُسکا جھوٹا ہونا لازم آتا ہی اسلیئے ضرور ہی کہ دونوں متحد ہوں تیسرا اصول ورک آف گاڈ یعنی قانون قدرت ایک علی عہد خدا کا ہی اور وعدہ اور وعید یہ قولی معاہدہ ہی اور اُن دونوں میں سے کوئی بھی خلاف نہیں ہو سکتا لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اُسکی تسلیم سے خدا کی قدرت مطلق میں نقصان آتا ہی جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا خیال ہی محض غلط اور وہم اور ناسمجھی ہی - چوتھا اصول خواہ یہ تسلیم کرو کہ انسان مذہب یعنی خدا کی عبادت کے لیئے پیدا ہوا ہی خواہ یہ کہ مذہب انسان کے لیئے بنایا گیا ہی - دونوں حالتوں میں ضرور ہی کہ انسان میں بہ نسبت دیگر

حیوانات کے کوئی ایسی چیز ہو کہ وہ اُس بار کے اُٹھانے کا مکلف ہو اور انسان میں وہ شے کیا ہی عقل ہی اس لئے ضرور ہی کہ جو مذہب اُسکو دیا جاوے وہ عقل انسانی کے مافوق نہ ہو۔ اگر وہ عقل انسانی کے مافوق ہی تو انسان اُس کا مکلف نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اُسکی ایسی مثال ہوگی جیسے بیل یا گدھے کو امر و نہی کا مکلف قرار دیا جاوے یا جونپور کا قاضی بنایا جاوے۔ مذہب اسلام اور خدا کا کلام اِن تمام نقصانوں سے پاک ہی۔ وہ بتاتا ہی کہ تم سمجھ لو اور سمجھ کر یقین کر لو کہ جو کچھ خدا بتاتا ہی اور کہتا ہی وہ سچ ہی۔ جانِ من مذہب اسلام اور خدا کے کلام کو دیو دیوی کے قصے مت بناؤ ورنہ جو فوقیت اسلام کو دوسرے مذاہب باطلہ سے ہی وہ ساقط ہو جاتی ہی۔ اور انسان عقل انسانی کی رُو سے قابل یقین نہیں رہتا جاہل ایک بات کو جو عقل انسانی کے مافوق ہی مان سکتا ہی اِس وجہ پر کہ فلاں بزرگ نے کہی ہی۔ اور اُس کا ایمان مضبوط رہتا ہی کیونکہ وہ اسکے سوا اور کچھ نہیں جانتا مگر جسکو خدا نے عقل انسانی یا اُسکا کوئی حصہ عطا کیا ہو وہ ایسی بات پر جو مافوق عقل انسانی ہی یقین نہیں کر سکتا۔ اب تمھارے دل میں بہت سے شبہات پیدا ہونگے اور تم خیال کروگے کہ مذہب اسلام اور قرآن مجید میں تو بہت باتیں مافوق عقل انسانی ہیں مگر یہ تمھاری سمجھ کا قصور ہی قرآن مجید اِس نقصان سے پاک ہی تم نے بہت مدت تک نوکری کی اب اُسکو چھوڑ دو علیگڈھ چلے آؤ یہاں رہو۔ چند مدت کی گفتگو اور سمجھانے اور بتانے کے بعد تم کو ثابت ہو جاویگا کہ اسلام میں اور قرآن مجید میں کوئی بات مافوق عقل انسانی نہیں ہے۔ والسلام

خاکسار
سید احمد

ازالہ آباد
۱۷ اگست سنہ ۱۸۹۲ع

ناظرین! سید احمد خاں نے اس خط میں جو چار اصول بیان کیے ہیں اُنیں پہلے اصول کو ادھورا رکھا ہی پورا عندیہ ظاہر نہیں کیا اسلیے ضروری معلوم ہوتا ہی کہ ہم اُن کا پورا عندیہ اور عقیدہ جو وہ کلام آلہی کی نسبت رکھتے تھے آپ کو سنا دیں۔ تفسیر سورہ بقر مطبوعہ

رفاہِ عام سٹیم پریس لاہور کے صفحہ ۱۲۲ پر فرشتوں کی بحث میں لکھتے ہیں "قرآن مجید بیشک کلام اللہ ہے مگر انسانوں کی زبان اور انسانوں کے کلام کے طرز پر۔ پس اس کلام کو مثل ایک انسان کے کلام کے تصور کرنا چاہیئے اور اُس سے معانی اور مطالب احکام و مقاصد اخذ کرنے اور اُس کے دلیلیں قائم کرنے میں اُس کو انسان کے کلام سے زیادہ رتبہ نہیں دینا چاہیئے"۔ (نعوذ باللہ)

اِن کے اِس عقیدے کا یہ اثر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ بھی کلامِ الٰہی کو انسانی تصنیف سے زیادہ باوقعت نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ایک جگہ کا ذکر ہے کہ دو جنٹلمین۔ ایک سنّی۔ ایک شیعہ ایک کمرہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نہیں معلوم کیوں اور کس ضرورت سے وہاں قرآن شریف ایک کرسی پر رکھا ہوا تھا اتفاق سے سُنّی جنٹلمین کو اوپر سے کوئی چیز اُتارنے کے لیے کرسی پر چڑھنے کی ضرورت ہوئی۔ بس ویسے ہی بے تکلف قرآن شریف پر بُوٹ رکھکر کھڑے ہوگئے اور وہ چیز اُتار لی۔ شیعہ جنٹلمین نے جو یہ دیکھا تو اُن کو یہ حرکت ناگوار گذری اور کہا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا قرآن پر بوٹ رکھکر کھڑے ہوگئے۔ مَیں بھی اگرچہ اپنے مذہب کا پابند نہیں ہوں لیکن اِس کتاب کی عظمت میرے دلمیں بہت کچھ ہے۔ سُنّی جنٹلمین نے جواب دیا کہ بات کیا ہے تعزیرات ہند جیسے ایک قانون کی کتاب ہے۔ یہ بھی ایک قانون کی کتاب ہے (انا للہ و انا الیہ راجعون) - علاوہ اِس اصول کے باقی جو تین اصول بیان کیے ہیں اُن کا اگرچہ عنوان اور طرزِ بیان جُدا جدا ہے لیکن مطلب سب کا ایک ہے اور وہ یہی کہ قرآن مجید (یا اسلام) میں کوئی بات عقلِ انسانی سے باہر نہیں ہے۔ اور اس سے مقصد فرشتہ و معجزات وغیرہ کی نفی کرنا ہے کہ یہ دور ازہ قیاس باتیں مفسّرین نے یہودیوں کی سُنی سُنائی لکھدی ہیں۔ اسلام میں انکی کوئی اصل نہیں ہے مگر یہ خیال سید صاحب کا کچھ تعجب خیز نہیں ہے۔ کیونکہ جب وہ سرے سے کلام الٰہی کو انسان کے کلام سے زیادہ رتبہ نہیں دیتے تو اُس میں کوئی بات عقلِ انسانی سے بڑھکر کیسے مان سکتے ہیں۔ مگر جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ کلام الٰہی کو تمام مخلوقات کے کلام پر وہی فضیلت ہے جو حق جلّ و علی شانہٗ کی ذات پاک کو تمام مخلوقات پر (چنانچہ حدیث

کے صاف الفاظ یہی ہیں) وہ قرآن مجید سے فرشتوں کا وجود بھی ثابت کرتے ہیں۔ معجزات کے بھی قائل ہیں۔ پس ایک مدت کے بعد سید احمد خاں کی مخالفت کا ایک اور بڑا سبب یہ بھی معلوم ہوا کہ علمار خدا کے کلام کو انسان کے کلام کے ساتھ وہی نسبت سمجھتے ہیں جو خدا کو انسان کے ساتھ ہی اور سید احمد خاں خدا اور انسان دونوں کے کلاموں کو برابری کا درجہ دیتے ہیں۔ علمار نے تفسیر لکھنے اور مسائل اخذ کرنے میں خدائی عظمت و جبروت کا برابر لحاظ رکھا سید احمد خاں نے اس کلام معجز نظام کو کبھی ایک لکچر اور اسپیچ سے زیادہ خیال نہیں کیا بس اب ہمارے زیادہ لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہی آپ خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ جو شخص کلام الٰہی کی نسبت یہ خیال ظاہر کرتا ہو وہ اپنے دعوے اسلام میں کہاں تک سچا ہوگا۔

دوسرا خط نواب محسن الملک کا بنام سید احمد خاں

حیدرآباد دکن ۱۹ ستمبر ۱۸۹۲ء

جناب عالی۔ آپ کا خط ۱۰ اگست کا لکھا ہوا پہونچا۔ مجھے اس کا ذرا بھی خیال نہ تھا کہ اُن دو فقروں پر جو یوں ہی سرسری طور پر میرے قلم سے آپکی تفسیر کی نسبت نکل گئے تھے آپ اتنی توجہ فرمائینگے۔ اور اُسکے متعلق ایسا بڑا خط لکھیں گے۔ مگر میں نہایت خوش ہوں کہ آپ نے اُس پر ایسی توجہ فرمائی اور مجھے اپنے شبہات کا زیادہ تفصیل سے عرض کرنے کا موقع دیا۔ مجھے امید ہی کہ آپ نہایت ٹھنڈے دل سے میری اس تحریر کو ملاحظہ فرماوینگے اور محققانہ جواب سے میرے دل کے سارے شکوک دور کر دینگے۔ آپ یقین کیجیے کہ میں اگرچہ آپ کے نزدیک آبائی تقلید کی دلدل میں پھنسا ہوں مگر اُس سے نکلنے پر آمادہ ہوں بشرطیکہ آپ مجھے ثابت کر دیں کہ میں درحقیقت کسی ایسی دلدل میں پھنسا ہوں اور یہ کہ اُس سے نکلنے کے بعد کسی ایسے گہرے تاریک اور آگ سے بھرے ہوئے غار میں گرنے کا اندیشہ نہیں ہی جسکی نسبت میرے حق میں دلدل میں پھنسا رہنا زیادہ مفید ہو۔ حضرت آپنے اٹھارہ برس کے بعد میرے دل پر تازیانہ لگایا ہی اور بھرے ہوئے زخم کو پھر ہرا کیا ہی

اگر اس کے درد سے چلاؤں اور نالہ وشیون کروں تو مجھے معذور سمجھیے - اور میرے شور و فغاں کو سنکر میرے درد کی دوا فرمائیے ایسا نہ ہو کہ آپ اور چوٹ لگا دیں اور مجھے چلانے اور غل مچانے پر زیادہ مجبور کریں -

جناب والا - آپنے میرے اُس خیال کی نسبت جو آپکی تفسیر کی نسبت ہی دو سبب قرار دیے ہیں - ایک آبائی خیالات کی پابندی - دوسرے علمار کے اقوال اور تفاسیر پر یقین پہلے امر کی نسبت میں تسلیم کرتا ہوں کہ خدانے اپنی مہربانی سے مجھے مسلمان کے گھر میں پیدا کیا - بچپن سے میرے کان میں اسلام کی باتیں ڈالیں - لڑکپن سے میں اسلامی باتیں سنتا رہا اور بلاشبہ اُن کا بہت بڑا اثر میرے دل پر ہوا مگر میں یہ بات نہیں مان سکتا کہ جو کچھ مَیں نے سُنا اور جو کچھ سُنی ہوئی باتوں کا اثر میرے دل پر ہوا وہ عموماً ایسا قوی تھا کہ اُسکو میں دل سے مٹا نہیں سکا - مَیں اپنی زندگی کے پچھلے دنوں پر جب ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں تو ایک بہت بڑا سلسلہ ایسے خیالات اور اعتقادات کا پاتا ہوں جن میں نہایت تغیر و تبدل ہوا ہی - بہت سی چیزیں ایسی دیکھتا ہوں جنکو اول میں صحیح سمجھتا تھا مگر اب غلط جانتا ہوں اور بہت سے خیالات ایسے ہیں جنکو ایک زمانہ میں بُرا جانتا تھا مگر اب اچھا سمجھتا ہوں - پھر مَیں یہ تغیر خیالات کا صرف جزئیات میں نہیں پاتا بلکہ اصول اور کلیات میں بھی - پس اگر آپ کے ارشاد کے موافق آبائی تقلید کی جڑ میرے دل میں ایسی مضبوط ہوتی کہ کسی طرح وہ اُکھڑ نہ سکتی تو میں اپنے دل سے ایسے خیالات کو جو لڑکپن سے میرے دل میں جمے ہوئے تھے کیونکر اُکھاڑ کر پھینک دیتا - اور بہت سی ایسی باتوں کو جو سنتے سنتے کالنقش فی الحجر ہو گئی تھیں - حرف اول کی طرح صفحۂ دل سے کس طرح مٹا سکتا - اسلیے جہانتک میں اپنے دلکو دیکھتا ہوں اُسے حق کے قبول پر آمادہ اور آبائی خیالات اور رسم و رواج اور قوم اور برادری کی پابندی سے آزاد پاتا ہوں - اسپر میری رائے جبکہ آپکی تفسیر کے بعض مضامین سے ایسی مخالف ہی کہ اُسکی نسبت تفسیر القول بمالا یرضیٰ بہ قائلہ کہہ بیٹھا تو اسکا کوئی

تو کوئی سبب ہوگا۔ بظاہر حالات تو مقتضی اس کے تھے کہ میں آپ کی راے سے اتفاق کرتا اور آپ کے ہر خیال کو اچھا سمجھتا اس لیے کہ میرے دل کو آپ سے وہ نسبت ہی جو لوہے کو مقناطیس سے جسطرح اُس کے اختیار سے خارج ہی کہ مقناطیس کیطرف نہ جُھکے اور اپنے آپ کو اُسکی کشش سے بچا سکے اِسی طرح میرے امکان میں نہیں ہی کہ آپ کی بات نہ مانوں اور آپکے خیالات کا ہمصفیر نہ ہوں مگر باوجود اسکے جبکہ میں آپ کی تفسیر کے بعض مضامین کا مخالف ہوا اور مخالف بھی ایسا کہ اُس مخالفت کو نہ آپ کی وہ عظمت و وقعت جو میرے دلمیں ہی روک سکی۔ نہ وہ محبت و ارادت جو مجھے آپ سے ہی اُسکی مانع ہوئی نہ آپ کی جادو بھری تحریر نے اثر کیا۔ نہ آپکی پر زور تقریر نے۔ تو میرے پیارے سید۔ خدا کے لیے انصاف کرو کہ اُس کا سبب بچپن کی سُنی سُنائی باتوں کا اثر ہوگا۔ یا اُس قوت ایمانیہ کا جس کے مقابلہ میں سارے خیالات محبت اور عظمت اور ارادت کے دب گئے اور یہ کمزور دل کا کام ہی یا اُس زبردست دل کا جس نے حق بات پر کسی اور چیز کو غالب نہ ہونے دیا۔

دوسرا سبب میری مخالفت کا آپ اُس اعتقاد کو قرار دیتے ہیں جو مجھے علماء کے اقوال اور تفاسیر کے رطب و یابس روایات پر ہی اور جو آپ کے نزدیک پہلے سبب کا قوی اور مضبوط کرنے والا ہی۔ آپ کی اِس تحریر نے مجھے نہایت متعجب کیا۔ اِس لیے کہ آپ سے بہتر کوئی نہیں جانتا کہ میرے خیالات اِس بارے میں کیا ہیں اور علماء اور اُنکی کتابوں کی نسبت میں کیا راے رکھتا ہوں آپ خوب جانتے ہیں کہ میرے نزدیک نہ کوئی کتاب خدا کی کتاب کے سوا غلطی سے پاک ہی گو وہ کیسی ہی اصح الکتب کیوں نہیں سمجھی گئی ہو اور نہ کوئی شخص سوائے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے خطا اور غلطی سے محفوظ ہی گو وہ صحابی اور امام ہی کیوں نہ ہو۔ بلاشبہ اسلام اسپر فخر کر سکتا ہی کہ اسمیں بہت بڑے مفسر اور محدث اور مجتہد اور عالم اور فقیہ اور حکیم ہوئے اور بہت مفید اور قابل قدر کتابیں لکھی گئیں اور ہمارے بزرگوں نے بہت بڑا ذخیرہ علم کا ہمارے لیے چھوڑا اور ہم اُن کے علم اور اجتہاد اور راے

اور تالیفات سے بہت بڑی مدد پاتے ہیں مگر کوئی بھی اُن میں معصوم نہ تھا۔ نہ کسی پر جبریل امین وحی لائے تھے نہ کسی کی شان میں خدا نے ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی فرمایا تھا۔ اسپر بھی اگر کوئی کسی کو ہر طرح سے ہر بات میں اور ہر حالت میں واجب التقلید سمجھے اور باوجود ظاہر ہو جانے غلطی کے خواہ وہ عقل و فطرت کی وجہ سے ہو یا کسی اور سبب سے اُسی کی کہی ہوئی یا لکھی ہوئی بات کو سچ سمجھتا اور یقین کرتا رہے تو وہ میرے نزدیک مشرک فی صفۃ النبوۃ ہی اور عقل سے خارج اور راہ راست سے کوسوں دور۔ کیا خوب فرمایا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے من جعل الحق وقفا علی احد من النظار فھو الی الکفر والتناقض اقرب۔ پس عالموں اور کتابوں کی نسبت میری یہ رائے ہو اور جیسے آپ خوب جانتے ہوں تو آپ میرے اُس تعجب اور تاسف کا اندازہ کرسکتے ہیں جو آپ کی اِس تحریر سے مجھے ہوا ہوگا خیر آپ کو اختیار ہی جو سبب چاہیں آپ اسکا قرار دیں خواہ بچپن کے خیالات کو خواہ علمار کے اقوال پر یقین کرنے کو مگر میرے نزدیک تو اسکا سبب صرف یہ ہی کہ آپ کی تفسیر بعض مقام پر تفسیر الکلام بما لا یرضی بہ قائلہ ہی۔ جناب من مجھے تو آپ نے اپنی تفسیر کے اعلے مقامات کے نہ سمجھنے پر یہ الزام لگایا کہ بچپن کی سنی سنائی ہوئی باتیں دل میں ایسی جم گئیں ہیں کہ اُنھوں نے غور و فکر کی قوت کو بیکار کر دیا ہی مگر یہ تو فرمایئے کہ اِس زمانے کے فلاسفر اور سائنس (علم) کے جاننے والے جو تمام درجے نیچر (فطرہ) کے طے کر کے نئی روشنی دُنیا میں پھیلا رہے ہیں اگر حضرت کی نسبت کہیں کہ گو آپنے تقلید چھوڑی کتابوں کو ردی سمجھا عالموں اور مفسروں کی تضحیک کی اور اپنے نزدیک بڑے بڑے درجہ پر قدم رکھا اور قرآن کو نیچر اور قوانین نیچر کے مطابق کرنے میں بڑی زحمت اُٹھائی مگر باوجود اِس عالی دماغی اور روشن ضمیری اور محققانہ خیالات اور حکیمانہ دماغ کے بچپن کی سُنی سنائی باتوں کے اثر سے آپ اپنے آپکو نہ بچا سکے۔ اور ابتک خدا کے مقر رسول کے قائل اور اصول دین کے معتقد بنے رہے (لیکن نا یہ بھی معلوم ہی کہ یہ رسول کے قائل اور اصول دین کے معتقد بھی کچھ دوسرے

ہی معنوں میں ہیں ؟ (مشتاق احمد) قصور معاف ۔ آپ کو اس کے جواب دینے میں
اتنی آسانی نہ ہوگی جتنی کہ مجھے آپ کے ارشاد کے جواب میں ہے اس لیے کہ
میں ایک حد پر پہونچکر عقل کو معزول اور فطرت سے اپنے آپ کو بے خبر کہہ کر اپنا
پیچھا چھڑا لونگا اور علے ابدین العجائبزکا اقرار کرنے لگوں گا مگر آپ کو بڑی مشکل پیش
آویگی کہ آپ ایک اصل کو بھی اصولِ دین سے اور ایک اعتقاد کو بھی منجملہ معتقدات
مذہب کے مارڈن سائنس (علومِ جدیدہ) اور زمانہ حال کے فلسفہ کی رُو سے
لا آف نیچر کے مطابق ثابت نہ کر سکیں گے ۔ یہ میرا کہنا درحقیقت معارضہ
بالمثل نہیں ہے اور نہ آپ کی جناب میں گستاخانہ خیال میں اپنی ارادت اور
عقیدت اور آپ کی شان کو اس سے بہت ارفع واعلےٰ سمجھتا ہوں کہ کوئی
بے ادبانہ اور گستاخانہ بات زبان پر لاؤں مگر عقیدت یا عظمت واقعات
کو بدل نہیں سکتی ۔ جو کچھ مَیں نے کہا ہے یہ ایک واقعہ ہے ۔ اور اس زمانے
کے فلاسفر اور حکیم اور نئی سائنس کے عالم مذہبی خیالات رکھنے والوں کی
نسبت یہی کہتے ہیں چنانچہ ایک بہت بڑا لو ربین عالم اپنی ایک مشہور
کتاب میں جہاں اُس نے خدا کی قدرت اور ارادہ اور علم اور تصرف
فی العالم اور خالق خیر و شر ہونے سے انکار کیا ہے اور اُسے صرف ایک
ایسی علۃ العلل قرار دیا ہے جسے کسی قسم کا اختیار یا تصرف عالم میں نہیں
ہے ۔ کہتا ہے کہ " یہ عقیدہ پُرانے خیالات سے زیادہ تر صاف اور
عاقلانہ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اُس کے ماننے کے لیے زیادہ قوت
دل کی ضرورت ہے اور جن لوگوں کو ہر معمولی واقعہ میں خدا کی خاص
قدرت اور ارادہ اور پیش بینی اور ہر روزمرہ کی چیزیں اُس کی نگرانی
اور علم کے آثار پانے کی عادت ہوگئی ہے اُن کو یہ عقیدہ سرد اور

غیر تسکین بخش معلوم ہوگا لیکن امیدیں اور خیالات واقعات کے مقابلے میں بے طاقت ہیں"۔ "ایک اور صاحب فرماتے ہیں" کہ جسے لوگ خدا اور خالق کہتے ہیں وہ خود انسان کا مخلوق ہے یعنی اپنے دل سے اُسے پیدا کر لیا ہے اور اپنے صفات کا جامع قرار دیا ہے۔ یہ صاحب دُنیا کے ناقص اور غیر مکمل اور بے ترتیب ہونے پر اُس کے بنانے والے کو براہ تمسخر و طنز نو آموز قرار دے کر خدا کے ماننے والوں کو احمق اور بے وقوف کہتے اور کتب آسمانی کے غلط اور جھوٹ ہونے پر اُنہیں کی شہادت لاتے ہیں چنانچہ انجیل سی پاک کتاب کی نسبت آپ فرماتے ہیں کہ "میری رائے میں کبھی دانشمند آدمی کو اس بات کے یقین دلانے کو کہ انجیل انسان کی بناوٹ بلکہ وحشیانہ ایجاد ہے صرف اسی قدر ضرورت ہی کہ وہ انجیل کو پڑھے" پھر آپ لوگوں سے فرماتے ہیں کہ "تم انجیل کو اس طور سے پڑھو جیسے کہ تم اور کسی کتاب کو پڑھتے ہو اور اُسکی نسبت ایسے خیالات کرو جیسے کہ اور کتابوں کی نسبت[1] کرتے ہو۔

اپنی آنکھوں سے تعظیم کی پٹی نکال ڈالو۔ اور اپنے دل سے خوف کے بھوت کو بھگا دو اور دماغ اوہام سے خالی کرو۔ تب انجیل مقدس کو پڑھو تو تم کو تعجب ہوگا کہ تم نے ایک لحظے کے لیے بھی کیونکر اس جہالت اور ظلم کے مصنف کو عقلمند اور نیک اور پاک خیال کیا تھا"۔ یہ خیالات ایک دو مصنفوں کے نہیں ہیں بلکہ اکثر سائنس کے جاننے والے مذہب کے ماننے والوں اور خدا کے متصف بصفات وجوبیہ و سلبیہ سمجھنے والوں پر نہایت تعجب اور تاسف کرتے ہیں پس جب تک کہ آدمی علم کی معراج کے اُس درجہ پر نہ پہونچ جاوے وہ ایسے لوگوں کے نزدیک ضرور آبائی خیالات کا پابند سمجھا جاوے گا۔ اور جب تک خدا اور رسول اور معاد اور اصول دین کو مانتا رہے گو وہ کتنے ہی زینے علم و نیچر کے طے کر چکا ہو مجھ ہی سا ضعیف القلب اور کمزور ٹھہرے گا۔ اگر فرق ہوگا تو کمی بیشی کا۔ مجھے ایسے لوگ زیادہ بودے دل کا

[1] وہ صاحب انجیل کی نسبت یہ کیا فرماتے ہیں آپ سرسید کو دیکھیے کہ وہ بھی قرآن مجید کو انسانی کلام سے زیادہ رتبہ نہیں دیتے۔

سمجھیں گے اس لیے کہ میں خدا کو قاضی الحاجات سمجھتا ہوں دعا کو ایک سبب حصول مقصد کا اور اجابت دعا کے معنی مطلب کا حاصل ہونا جانتا ہوں۔ جبرئیل کو ایک فرشتہ وحی کا لانے والا اور نبوت کو ایک عہدہ خدا کا دیا ہوا سمجھتا ہوں آپ کو ان باتوں کے انکار سے بہ نسبت میرے زیادہ قوی اور زیادہ ہمت والا سمجھیں گے۔

بہر حال جو دو سبب آپ نے میری مخالفت کے اپنی تفسیر سے قرار دیے ہیں اُن میں سے کسی ایک کو بھی میں نہیں مانتا۔ اب رہا یہ امر کہ میرے پاس خدا کی بھیجی ہوئی وحی آئی تھی جس سے مجھے ثابت ہوا کہ مرضی قائل یعنی خدا کی وہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہیں اُسکی نسبت بادب تمام عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر تو وحی آنے کی ضرورت جب ہوتی کہ میں کوئی ایسی بات بیان کرتا جو انسان کی معمولی سمجھ سے خارج ہوتی یا وہ معنی قرآن کے بیان کرتا جسے نہ صاحب الوحی سمجھے تھے نہ صحابہ نہ ائمہ نہ عامہ مسلمین ہاں آپ نے بعض مقامات پر قرآن کے وہ معنی بتائے ہیں جو نہ لفظوں سے نکلتے ہیں نہ محاورہ عرب کے مطابق ہیں نہ سیاق کلام کے موافق بلکہ جو اسلام کا منشا اور قرآن کا مقصود اور پیغمبر کی ہدایت کی اصلی غرض ہے اُن سب کے خلاف ہیں۔ ایسی صریح اور صاف بات کے لیے مجھ پر وحی آنے کی ضرورت نہ تھی اور خدا کی عام مرضی معلوم ہونے کے بعد جو معنی اُسکے خلاف لیے گئے اُسپر لا یرضی بہ قائلہ کہنا بیجا نہ تھا۔ اب رہا اسکا ثبوت۔ وہ میں آیندہ آپکی تفسیر کے بعض اقوال نقل کر کے بخوبی دونگا۔ مگر اسوقت اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آپ بہت جگہ تسامح کے درجہ سے گذر کر مغالطہ میں پڑ گئے اور جس حد پر پہونچکر آپ کو ٹھیرنا چاہیے تھا اُس سے گذر گئے۔

آپ نے اُن باتوں کو جو اس زمانہ کے علم و سائنس نے پیدا کی ہیں بغیر کسی شک و شبہ کے صحیح اور یقینی مان لیا اور جو باتیں قرآن میں بظاہر اُسکی مخالف معلوم ہوئیں اُنمیں ایسی تاویلیں کرنی شروع کیں کہ قرآن کا مقصد ہی فوت ہو گیا اور اسپر ستم ظریفی آپکی یہ ہے کہ آپ تاویل کو کفر قرار دیتے اور اپنی تفسیر کو قرآن کے الفاظ اور سیاق اور مقصود و محاورہ

کے مطابق بتاتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی آپ کا اصل مقصد کوسوں دور رہا۔ اِس لیئے کہ نیچر اور لاآف نیچر اگر وہی ہی جو اِس زمانے کے یورپین حکیم بتاتے ہیں تو خدا کی خدائی اور رسولوں کی رسالت اور عذاب و ثواب کا اقرار وہی آبائی تقلید اور بچپن کی سُنی سُنائی باتوں کا اثر سمجھا جاوے گا۔ اور قرآن باوجود انکار معجزات اور خرق عادات اور دعا اور اجابت دعا اور فرشتوں اور جنات کے نیچر اور لاآف نیچر کے مخالف ہی رہیگا۔ پس میرے نزدیک آپ دو مصیبتوں میں سے ایک میں سے بھی نہ نکل سکے۔ کہیں قرآن کے معنے سمجھنے میں غلطی کی۔ اور کہیں نیچر کے ثابت کرنے میں بعض جگہ تو آپ قرآن کا وہ مطلب سمجھے جو نہ خدا سمجھا نہ جبرئیل نہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نہ صحابہ نہ اہلبیت نہ عامہ مسلمین۔ اور کہیں نیچر کے دائرہ سے نکل گئے اور مذہبی آدمیوں کی طرح پرانے خیالات اور پرانی دلیلوں اور پرانی باتوں کا گیت گانے لگے۔ چنانچہ آپ کی تفسیر میں دونوں باتوں کا جلوہ نظر آتا ہی جہاں آپنے دعا اور اجابت دعا کے مشہور معنوں سے انکار کیا معجزات اور خرق عادات کو ناممکن سمجھ کر حضرت عیسےٰؑ کے بے باپ پیدا ہونے اور اُنکی طفلی کے زمانے کے واقعات اور احیائے اموات وغیرہ باتوں کو اہل کتاب کی کہانیاں بتلایا وہاں آپنے دکھا دیا کہ آپ کی تفسیر قرآن کے الفاظ اور سیاق عبارت اور اُسکے عام منشا سے کچھ مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتی اور جہاں آپنے آپ کی خدائی اور پیغمبر کی پیغمبری اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے اور ثواب عذاب وغیرہ کا اقرار کیا گو انکی حقیقت میں بھی علمار کی رایوں سے بہت کچھ اختلاف کیا ہی وہاں آپنے ثابت کر دیا کہ نیچر اور لاآف نیچر کا کچھ بھی اثر آپ پر نہیں ہوا۔ وہی سب پرانے خیالات آپکے دل میں سمائے ہوئے ہیں جن پر نیچر کے جاننے والے اور لاآف نیچر کے ماننے والے ہنستے ہیں۔ کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ اعتقادات لاآف نیچر (قوانین فطرت) کے مطابق ہیں۔ یا ماڈرن سائینس (علوم جدیدہ) سے انکی تصدیق ہو سکتی ہی اور اعتقادات کا تو کیا ذکر ہے آپ صرف خدا کی خدائی فلسفہ جدیدہ سے ثابت کر دیجئے۔ اور اُسکے خالق اور قادر اور حکیم اور علیم

ہونے کا ثبوت حکما زمانہ حال کے اقوال سے پیش کیجئے۔ میرے نزدیک اکثر فلسفی تو ایسے
باہمت اور بہادر اور دل کے قوی ہیں کہ وہ خدا کے وجود کے اعتقاد سے بڑھ کر کسی بات
کو بیہودہ نہیں سمجھتے۔ اور نعوذ باللہ خدا کو خود انسان کے وہم و خیال کا پیدا کیا ہوا سمجھتے
ہیں۔ ہاں بعض اُسکے وجود کے قائل ہیں مگر وہ بھی اُس خدا کے نہیں جو ابراہیم و محمد علیہما الصلوٰۃ
والسلام کا خدا ہی بلکہ اُس خدا کے جو ڈاروں اور ہیکل کا خدا ہی جس کا نام اُن کی زبان میں
فرسٹ کاز اور عربی میں علۃ العلل ہی و ایں خدا بجوئے نمی آرزد و بکار مانے آید۔ اُن کے
خدا نے نہ کسی چیز کو اپنے ارادے اور مرضی سے پیدا کیا اور نہ کر سکتا ہی نہ کسی چیز میں تصرف
کیا اور نہ کر سکتا ہی نہ وہ کسی قسم کا اختیار رکھتا ہی نہ کسی چیز کو جانتا ہی نہ کسی بات کو سُنتا ہی نہ
سمیع الدعوات نہ فاعل مختار ہی نہ قادر علی الاطلاق۔

ہاں اس سے انکار نہیں کہ وہ ایک ہستی ہو جس سے کوئی غیر معلوم مادہ بلا اُسکے اختیار
اور بغیر اُسکی مرضی کے اور بغیر تقدم زمانہ کے ظاہر یا پیدا ہو گیا۔ اور اُس سے دوسرا اور دوسرے سے
تیسرا اور تیسرے سے چوتھا و ہلم جرا مواد پیدا ہوتے ہوتے مادی کائنات کا ظہور ہوا اور
ایک ناکامل حالت سے آہستہ آہستہ ترقی کر کے لاکھوں کروڑوں برسوں کے تغیرات اور تنازعات
کے بعد یہ دُنیا بنی۔ اور جو کچھ اب ہم دیکھتے ہیں اُسکا اس طور پر ظہور تدریجی عمل میں آیا۔
ولکن لیس فیھما ما یدل علی الاختیار بل کلہ عن الاضطرار پس اگر یہ مسئلہ
نیچر کا مان لیا جاوے اور یہ لاز آف نیچر تسلیم کر لیئے جاویں تو فرمایئے کہ وہ خدا جو خالق
اور صانع قادر اور مرید سمیع علیم مصور اور حکیم اور کیا کیا مانا جاتا ہی کہاں باقی رہتا ہے اور
جب تک کوئی ڈاروں کا ہمخیال اور ہیکل کا ہمصفیر نہ بنجاوے کیونکر وہ دل کا مضبوط اور
دانشمند کہا جا سکتا ہی۔ رہا اُن کا ہمخیال اور ہمصفیر ہونا اس کی کسی اور کو خواہش ہو تو ہو
مگر مجھے تو نہ اسکی خواہش اور نہ طاقت میرا بودا دل اور ضعیف دماغ تو اپنے اولڈ پرانے
خدا کے چھوڑنے اور ساری صفات سے اُسے خالی کر کے صرف فرسٹ کاز (علۃ العلل) ماننے

سے بہت گھبراتا اور لرزتا ہی۔

میں تو اپنی دانائی اور بزدلی کو اپنے حق میں ایسے حکیموں کی دانائی اور جوانمردی سے بہت زیادہ مفید سمجھتا ہوں لان البلاھۃ ادنی الی الخلاص من فطانۃ تبراء والعمی اقرب الی السلامۃ من بصیرۃ حولاء۔ اب میں اس خط کو تمام کرتا ہوں اس لیئے کہ جو دلچسپ مضمون آپنے چھیڑا ہی وہ ایک یا دو خط میں نہیں آسکتا ضرور ہی کہ ایک سلسلہ ایسی تحریرات کا آپکی اور آپ کی بدولت اور شایقین کی خدمت میں پیش کیا جاوے۔ میں اگلے خط میں نیچر اور لاآف نیچر اور ورک آف گاڈ یعنی خدا کے کام اور ورڈ آف گاڈ یعنی خدا کے کلام سے جو آپکی تفسیر کے اصول میں سے ایک اصول ہی بحث کرونگا۔ اور اس بات کو دکھا دونگا کہ اس زمانہ کی سائینس کی رُو سے جن کو آپ ورک آف گاڈ اور ورڈ آف گاڈ کہتے ہیں بلکہ خود گاڈ خیالی ڈھکوسلے اور اولڈ فیشن والوں کے سڑےسل خیالات ہیں کہاں کا گاڈ اور کہاں کا ورک آف گاڈ علم کی روشنی نے ان تاریک خیالات سے دنیا کو پاک کرنا شروع کردیا ہی اور جنکے دل نئے خیالات کی تیز شعاعوں سے روشن ہوگئے ہیں وہ اِن لغویات کو کچھ نہیں سمجھتے اُنکے نزدیک اِن پُرانی باتوں اور اِن جہالت و وحشت کے یادگار خیالات کی جگہ اب باقی نہیں رہی اِلّا اُن دلوں میں جو آبائی تقلید کے بندوں میں پھنسے ہوئے اور بچپن کی سُنی سنائی باتوں کے دام میں گرفتار ہیں۔ ورنہ ماڈرن سائینس نے فتوی دیدیا ہی کہ خدا وجود معطل ہی رزاقی اور الوہیت بیہودہ خیالات ہیں دعا اور عبادت وحشیوں اور جاہلوں کے ڈر اور خوف کا نتیجہ ہی۔ نبوت دھوکہ کی ٹٹی ہی۔ وحی افسانہ ہی۔ الہام خواب ہی۔ روح فانی ہی۔ قیامت ڈھکوسلہ ہی۔ عذاب وثواب انسانی اوہام ہیں۔ دوزخ وجنّت الفاظ بے معنیٰ ہیں۔ انسان صرف ایک ترقی یافتہ بندر ہی۔ مابعد الموت سزا ہی نہ جزا۔ وہ مرنے کے بعد سب جھگڑوں اور قصوں سے پاک ہی۔ پس اے میرے بزرگ سرسید۔ یہ ہیں خیالات اُن لوگوں کے جو کہ حقیقت میں دل کے قوی اور عقل کے کامل اور حکمۃ کے موجد اور علوم کے دریا کے تیراک ہیں

الذین یستحبون الحیوٰۃ الدنیا علی الاخرۃ ویصدون عن سبیل اللہ ویبغونھا عوجا اولئک فی ضلال بعید ؁

ناظرین! اِن دونوں خطوں سے محسن الملک کی سابقہ حمیت اسلامی اور قوتِ ایمانی کا پورا پتہ چلتا ہی اگر یہ خط و کتابت کا سلسلہ کچھ دنوں اِسی طرح جاری رہتا تو اُمید کامل تھی کہ سید احمد خاں کی نہ صرف مذہبی بکواس کا بلکہ اُس سارے خبط کا جو نادان دوست کی صورت میں ظاہر ہوکر مسلمانوں کو تباہ و برباد کرگیا قلع و قمع ہو جاتا - مگر بُرا ہو اس طمع وہوس نام و نمود کا - کہ وہ بھی سید احمد خاں کے جُل میں آکر علیگڈھ آ بیٹھے - اور بعد انتقال مرشد تسبیح و مصلےٰ کو بالائے طاق رکھکر سجادہ نشینی کا فرض اِس عرقریزی و تندہی سے ادا کیا کہ سید احمد خاں سے بھی کئی مقام آگے بڑھ گئے - اُسی زمانہ میں خان بہادر سید اکبر حسین صاحب پنشنر جج الہ آبادی نے ایک رباعی نواب صاحب کے حسب حال لکھی تھی جو ذیل میں درج ہی -

مہدی کو بُرا بھلا جو چاہو وہ کہو — لیکن دکھلادی اُس نے بیوٹی اپنی
لاکھوں ہی کے ڈھیر کرد ئے کالج میں — پوری کردی یہ اُس نے ڈیوٹی اپنی

اب ہم حسب وعدہ آپکے سامنے اصل مضمون پیش کرتے ہیں - براہ مہربانی اسکی ہر ایک بحث کو بغور دیکھتے جائیے - اور یہ یاد رکھیے کہ

س سے سید احمد اور م سے مشتاق احمد مراد ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ

اگر ہو تم شک میں اس کلام سے جو اُتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورۃ اس کی مانند

س۔ مِمَّا نَزَّلۡنَا سے مراد قرآن ہی جو نبی پر بذریعہ وحی کے خدا کی طرف سے نازل ہوا ہی۔ پس اس مقام پر جب تک کہ وحی اور نبوت کی حقیقت نہ بیان ہو اُس وقت تک اس آیت کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ سید صاحب اول نبوت کی حقیقت بیان کرتے ہیں سنیے

مَیں نبوت کو فطری چیز سمجھتا ہوں جو انبیار میں بمقتضاے اُنکی فطرت کے مثل دیگر قواے انسانی کے ہوتی ہی جس انسان میں وہ قوت ہوتی ہی وہ نبی ہوتا ہی اور جو نبی ہوتا ہی اسمیں وہ قوت ہوتی ہی۔ جسطرح کہ تمام ملکات انسانی اسکی ترکیب اعضا دل و دماغ و خلقت کی مناسبت سے علاقہ رکھتے ہیں اسی طرح ملکہ نبوت بھی اُس سے علاقہ رکھتا ہی۔ یہ بات کچھ ملکہ نبوت پر ہی موقوف نہیں ہے ہزاروں قسم کے جو ملکات انسانی ہیں بعضی دفعہ کوئی خاص ملکہ کسی خاص انسان میں از روے خلقت و فطرت کے ایسا قوی ہوتا ہی کہ وہ اسی کا امام یا پیغمبر کہلاتا ہی۔ لوہار بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر کہلاتا ہی۔ شاعر بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہی۔ ایک طبیب بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہی۔ مگر جو شخص روحانی امراض کا طبیب ہوتا ہی وہ پیغمبر کہلاتا ہی۔

خدا اور پیغمبر میں بجز اُس ملکہ نبوت کے جس کو ناموس اکبر اور زبان شرع میں جبرئیل کہتے ہیں اور کوئی ایلچی پیغام پہونچانے والا نہیں ہوتا اُس کا دل ہی وہ آئینہ ہوتا ہی جسمیں تجلیات ربانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہی۔ اُسکا دل ہی وہ ایلچی ہوتا ہی جو خدا کے پاس پیغام لیجاتا ہی اور خدا کا پیغام لیکر آتا ہی۔ وہ خود ہی وہ مجسم چیز ہوتا ہی جسمیں سے خدا کے کلام کی آوازیں نکلتی ہیں۔ وہ خود ہی وہ کان ہوتا ہی جو خدا کے بے حرف و بے صورت کلام کو سنتا ہی خود

اُسی کے دل سے فوارہ کی مانند وحی اُٹھتی ہی اور خود اُسی پر نازل ہوتی ہی اُسکا عکس اُسکے دل پر پڑتا ہی جسکو وہ خود ہی الہام کہتا ہی۔ اُسکو کوئی نہیں بُلواتا بلکہ وہ خود بولتا ہی وہ خود اپنا کلام نفسی اِن ظاہری کانوں سے اسی طرح سنتا ہی جیسے کوئی دوسرا شخص اُس سے کہہ رہا ہی۔ وہ خود اپنے آپ کو اِن ظاہری آنکھوں سے اس طرح پر دیکھتا ہی جیسے دوسرا شخص اُسکے سامنے کھڑا ہوا ہی۔ ہم بطور تمثیل کے اسکا ثبوت دیتے ہیں ہزاروں شخص ہیں جنھوں نے مجنونوں کی حالت دیکھی ہوگی وہ بغیر بولنے والے کے اپنے کانوں سے آوازیں سنتے ہیں۔ تنہا ہوتے ہیں مگر اپنی آنکھوں سے اپنے پاس کسی کو کھڑا ہوا باتیں کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ سب اُنہیں کے خیالات ہیں جو سب طرف سے بے خبر ہو کر ایک طرف مصروف اور اسمیں مستغرق ہیں اور باتیں سُنتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔ پس ایسے دل کو جو فطرت کی رُو سے تمام چیزوں سے بے تعلق اور روحانی تربیت پر مصروف اور اسمیں مستغرق ہو ایسی واردات کا پیش آنا کچھ بھی خلاف فطرت انسانی نہیں ہی ہاں ان دونوں میں اتنا فرق ہی کہ پہلا مجنوں اور پچھلا پیغمبر ہے۔

(سید صاحب نے نبوت کی حقیقت تو جنون بتائی ہی اب وحی کی حقیقت سُنیے ۱۲ م) اور وحی وہ چیز ہے جو قلب نبوت پر بسبب اُسی فطرت نبوت کے نقش ہوئی ہی۔ وہی انتقاش قلبی کبھی مثل ایک بولنے والی آواز کے انہیں ظاہری کانوں سے سُنائی دیتا ہی۔ اور کبھی وہی نقش قلبی دوسرے بولنے والے کی صورت میں دکھائی دیتا ہی مگر بجز آپ کے نہ وہاں کوئی آواز ہی نہ بولنے والا۔ خدا نے بہت سی جگہ قرآن میں جبرئیل کا نام لیا ہی چنانچہ سورۂ بقر میں فرمایا ہی کہ جبرئیل[۱] نے تیرے دل میں قرآن کو خدا کے حکم سے ڈالا ہی دل پر اُتارنے والی یا دل میں ڈالنے والی وہی چیز ہوتی ہی جو خود انسان کی فطرت میں ہو نہ کوئی دوسری چیز جو فطرت سے خارج اور خود اُسکی خلقت سے جس کے دل پر ڈالی گئی ہے

---

۱ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ الخ ۱۲

جداگانہ ہوا اِس سے ثابت ہوتا ہی کہ اُسی ملکہ نبوت کا جو خدا نے انبیاء میں رکھا ہی جبرئیل نام ہی۔

م عقائد کا یہ مسئلہ ہی النصوص تحمل علی ظواھرھا - والعدول عنھا الی معان یدعیھا اھل الباطن الحاد۔ یعنی آیات قرآنی اور احادیث کے معانی متعارف طور پر ہی لیئے جاوینگے مگر جسکے معانی کا متعارف طور پر نہ لینا بہ تواتر ثابت ہوگیا ہوا اور پھیرنا آیتوں اور حدیثوں کا معانی متعارف سے ایسے معانی کی طرف جسکا اہل باطن ادعا کرتے ہیں اسلام سے پھیرنا اور بددینی ہی۔ ملحدوں کا ایک فرقہ ہی جو اپنے آپکو اہل باطن کہکر صوفیہ میں شمار کرتا ہی۔ اسکا قول ہے کہ قرآن وحدیث کے معنی یہ نہیں ہیں جو الفاظ کی ظاہر دلالت سے سمجھے جاتے ہیں بلکہ قرآن وحدیث کو اللہ ورسول اللہ صلعم اور اولیاء اللہ کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا ہی مثلاً اقیموا الصلوٰۃ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نماز پڑھو بلکہ نماز مناجات ہی اللہ تعالےٰ سے حضور قلبی کے ساتھ اور یہ قیام وقعود محض بیکار ہی اور روزے کی اصل یہ ہی کہ نفس کو اُسکی خواہشوں کے پورا کرنے سے روکے۔ اور زکوٰۃ کی اصل یہ ہی کہ مال کی محبت ایک قلم دل سے نکال ڈالے۔ اور حج کی اصل سیر ہی اللہ تعالےٰ کی طرف۔ اور مناسک کی اصل ہے اللہ میں اور رسول میں خیال جمانا۔ نظر دوڑانا۔ جب نفس ان مقاصد کو بلا وسائل پالیگا یہ وسائل اس سے ساقط ہوجاینگے اسی طرح شیعہ اسماعیلیہ اور منصوریہ اور خطابیہ کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں جو وضو۔ تیمم۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج۔ بہشت۔ دوزخ وغیرہ کا مذکور ہی وہ ظاہر پر محمول نہیں یعنی اُنکے جو معنی لغت سے مفہوم ہوتے ہیں وہ شارع کی مراد نہیں۔ اسیواسطے یہ ملاحدہ باطن کتاب وسنت پر عمل کرنے کو واجب بتلاتے ہیں اور اُنکے نزدیک ظاہر پر عمل کرنا کفر ہے۔ مثلاً روزہ کا باطن مذہب کا مخفی رکھنا۔ نماز کا باطن امام وقت کی فرمانبرداری بیان کرتے ہیں اور اسی طرح ہر کار شرعی کا باطن قرار دیتے ہیں اسی وجہ سے فقہاے اسماعیلیہ کو باطنیہ بھی کہا کرتے ہیں۔ یہی حال سید احمد خاں کا ہی آپنے بھی نصوص کو ظاہری معنی سے بدل دیا ہی

مثلاً خدا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیئے فرماتا ہی وَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ ہوا کو ہم نے سلیمانؑ کا تابع کیا تھا سید صاحب لکھتے ہیں کہ غبارہ پر حضرت سلیمان سوار ہوتے تھے جو دخان یا ہوا کے زور سے چلتا تھا اور کوئی معجزہ کی بات نہ تھی ۔ و نیز اسی مقام پر لکھا ہی کہ خدا نے سورۂ والنجم میں جو یہ فرمایا ہی کہ مَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش نفس سے نہیں کہتا مگر یہ تو وہ بات ہی جو اُسکے دل میں ڈالی گئی ہے ۔ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ذُو مِرَّةٍ اُسکو سکھایا بڑی قوت والے صاحب دانش نے فَاسْتَوَىٰ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلَىٰ پھر ٹھیرا اور وہ بلند کنارے پر تھا ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ پھر پاس ہوا اور ادھر کھڑا ہوا فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنَىٰ پھر دو کمان یا اُس سے کم فاصلہ رہ گیا فَاَوْحَىٰ اِلَىٰ عَبْدِهٖ مَا اَوْحَىٰ پھر اپنے بندے کے دلمیں ڈالی وہ بات جو ڈالی ۔ یہ تمام مشاہدہ اگر انہیں ظاہری آنکھوں سے تھا تو وہ عکس خود اپنی تجلیات ربانی کا تھا جو بمقتضائے فطرت انسانی اور فطرتِ نبوت دکھائی دیتا تھا ۔ اور در اصل بجز ملکۂ نبوت کے جسکو جبرئیل کہو یا اور کچھ کچھ نہ تھا ۔ ناظرین یہ سب باتیں اصل شرع کے ہادم ہیں بلکہ در اصل اُلٹے نبی علیہ السلام کی تکذیب ہی کیونکہ مدار شرع کا اعمال ظاہری اور تکالیف خارجی پر ہی پس اگر باطنی طریقوں اور تلقین کا اعتبار کیا جاوے تو یہ سب باتیں بیکار ہوئی جاتی ہیں اور سب کا دار و مدار شیون قلبی پر آکر ٹھیرتا ہی اس سے شریعت کا باطل کرنا ہی دوسرے جب قرآن و حدیث سے مراد یہ معنی متعارف نہیں اُنکا مقصود اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء اللہ اور فرقۂ باطنیہ اور سید احمد خاں کے سوا اور کوئی نہیں سمجھتا تو پھر تمام خلق کے لیئے قرآن کا بھیجنا لغو اور بیکار ہی سید احمد خاں جو معانی متعارف کو چھوڑ کر برخلاف سلف و خلف الگ راہ چلے ہیں اور دل کھولکر کلام الٰہی میں اپنی رایوں کو دخل دیا ہی (جسپر اُنکے حواری اُنکو اسلام میں زندہ جان ڈالنے والا سمجھتے ہیں) وہاں کیا قرینہ ہی اور کونسا امر ہی جو معانی متعارف کو جسکو پیغمبر علیہ السلام کے ہمزمان و ہمزبان سمجھتے آئے ہیں صحیح نہیں ہوتے ۔ جنابمن اگر علماء اسکی محافظت نہ کرتے تو قرآن

تو کچھ کا کچھ بدل دیا ہوتا۔ سورۂ یوسف کی تفسیر میں ایک صوفی نے اس قصّہ کو نفس و روح پر ایسا چسپاں کیا ہے کہ باید و شاید پھر اس سے کوئی یوں کہہ سکتا ہے کہ در اصل یوسف اور یعقوب کوئی شخص نہ تھے بلکہ یہی دو نفس اور روح مراد ہیں۔ آپ سید احمد خاں کی تفسیر میں اول سے آخر تک یہی دیکھیں گے کہ جس آیت کے ظاہر معنی پر تمام علماء کا اتفاق ہوگا احادیث صحیحہ سے برابر اسکی تصدیق ہوتی ہوگی آپنے اپنی ہڑ سب سے الگ ہانکی ہے۔

اب ہم اس مقام پر وہ حدیثیں نقل کرتے ہیں جسمیں وحی کا بذریعۂ جبرئیل علیہ السلام نازل ہونا صاف طور پر بلا کسی تاویل کے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اول اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچی خواب سوتے میں دکھائی دیتی تھیں اور جو خواب آپ دیکھتے تھے وہ بعینہ پوری ہوتی تھی۔ پھر اسکے بعد جب آپ کو تنہائی پسند ہوئی تو آپ غار حرا میں خلوت گزین ہو گئے۔ اور کئی کئی روز تک وہیں رات دن عبادت کیا کرتے تھے۔ کھانا اس مدت کا اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جب کھانا ختم ہو جاتا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے لیجایا کرتے تھے آپکا مدت تک یہی طریقہ رہا حتّٰی کہ ایک روز غار حرا ہی میں آپ پر وحی نازل ہوئی اور وہ اس طرح پر کہ ایک فرشتہ آیا اور آپ سے کہنے لگا کہ پڑھ۔ آپنے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر فرشتہ نے آپ کو پکڑا اور زور سے دبایا کہ آپ کو شاق معلوم ہوا۔ پھر چھوڑ کر کہا کہ پڑھ۔ آپنے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر فرشتہ نے آپکو پکڑا اور دوسری دفعہ اسی زور سے دبایا۔ پھر چھوڑ کر کہا کہ پڑھ۔ آپنے پھر یہی فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتہ نے پھر آپ کو پکڑا اور اسی طرح تیسری دفعہ زور سے دبایا۔ پھر چھوڑ کر کہا اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ پھر وہاں سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ کلمات پڑھتے ہوئے اسطرح کہ آپ کا دل دھڑک رہا تھا لوٹے اور خدیجہ رضؓ کے پاس داخل ہو کر فرمایا مجھے کپڑا اڑھا کپڑا اڑھاؤ۔ حضرت خدیجہ رضؓ نے کپڑا اڑھا دیا تو کچھ دیر کے بعد آپسے خوف زائل ہوا۔ پھر آپنے

سارا قصہ سنایا اور فرمایا کہ میں اپنی جان کا خوف کرتا ہوں حضرت خدیجہ رضہ نے عرض کیا کہ ہرگز نہیں اللہ تعالےٰ آپ کو کبھی رنجیدہ نہیں کریگا۔ آپ صلہ رحم کرتے ہیں لوگوں کی مصیبت میں مدد کرتے ہیں میہماں نوازی کرتے ہیں پھر خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو اپنے چچا کے بیٹے ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں ورقہ بن نوفل نے حال پوچھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سارا قصہ جو کچھ گذرا تھا سُنا دیا۔ ورقہ بن نوفل نے سُنکر کہا کہ یہ وہ ناموس (جبرئیل) ہی کہ جسکو خدا نے موسیٰؑ پر اُتارا تھا۔ کاش میں آپکے زمانہ نبوت میں جوان ہوتا۔ کاش میں اُسوقت زندہ ہوتا کہ جب آپکی قوم آپ کو نکالیگی۔ آپنے فرمایا کہ کیا وہ مجکو نکالیں گے ورقہ نے کہا کہ ہاں جو نبی گذرا ہی اُسکے ساتھ دشمنی ضرور ہوئی ہی۔ اگر وہ زمانہ مَیں نے دیکھا تو میں آپکی مدد کرونگا مگر ورقہ کا زمانہ نبوت سے پہلے ہی انتقال ہوگیا۔ اب سید صاحب اِس حدیث میں فرشتہ کی کیا تاویل کرینگے کون رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ کسنے آپکو تین مرتبہ پکڑا اور دبایا کسنے آپکو پڑھایا۔ اور کون وہ ناموس تھا کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا مگر سید صاحب کے ہاں تو سیدھا اور کھرا جواب یہ ہوگا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہی اسکی صحت مشتبہ ہی ہیچ ہی۔ خوئے بدرا بہانہ بسیار۔

اور لیجیے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہی کہ ایک روز ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص سفید کپڑوں والا۔ سیاہ بالوں والا کہ جسپر نہ کوئی سفر کا نشان معلوم ہوتا تھا اور نہ ہم میں سے کوئی اُسکو پہچانتا تھا آیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے گھٹنے ملاکر اور آپکی رانوں پر ہاتھ رکھکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) مجھے اسلام بتا یئے آپنے فرمایا اسلام یہ ہی کہ تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہے اور نماز پڑھے۔ زکوٰۃ ادا کرے۔ رمضان کے روزے رکھے اگر طاقت ہو حج کرے۔ اُس شخص نے سُنکر کہا کہ آپنے سچ فرمایا۔ حضرت عمر رضہ فرماتے ہیں کہ ہم کو تعجب ہوا کہ یہ شخص سوال بھی کرتا ہی اور تصدیق بھی کرتا ہی پھر پوچھا کہ ایمان کیا چیز ہے

آپنے فرمایا کہ ایمان یہ ہی کہ اللہ اور اُسکے فرشتوں اور اُسکی کتابوں اسکے رسولوں اور قیامت پر ایمان لاوے۔ اور اِسپر کہ بُرائی بھلائی سب اُسی کی طرف سے ہی یہ سُنکر اُسنے کہا کہ آپنے سچ فرمایا۔ پھر پوچھا کہ احسان کیا چیز ہی۔ آپنے فرمایا کہ احسان یہ ہی کہ تو اللہ کی عبادت اسطرح کرے کہ گویا تو اُسکو دیکھ رہا ہی۔ اگر تو اُسکو نہ دیکھتا ہو تو وہ تجکو دیکھتا ہی۔ غرضکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر وہ شخص چلا گیا اور میں کچھ دیر ٹھیرا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ ای عمر تو جانتا ہی کہ یہ شخص کون تھا میں نے عرضکیا کہ اللہ اور اُسکا رسول زیادہ جانتے ہیں آپنے فرمایا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے اسطرح سوال کرکے تمکو دین سکھانے آئے تھے۔ علاوہ اسکے اور بہت سی احادیث ہیں جو فرشتوں کے وجود پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں ہم انشاءاللہ تعالےٰ ہر ایک موقع پر جہاں سید صاحب نے فرشتوں کا ذکر کیا ہی آپ کو برابر سنائینگے۔

فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ

لاؤ تم کوئی سورت اسکی مانند

م۔ اِس پوری آیت کے نازل ہونیکا سبب یہ ہی کہ اُس زمانہ میں اہلِ عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا زعم تھا اسلیئے اُنکا یہ زعم توڑنے کی غرض سے خدا نے قرآن کو اعلےٰ درجہ کا فصیح و بلیغ اُتار کر اُن سے اسکا مثل طلب کیا ہی۔ اور مقصود اِس سے یہی تھا کہ وہ قرآن کا من اللہ ہونا تسلیم کرلیں آخر یہی ہوا کہ وہ اسکی مثل ایک سورت بھی نہ بنا سکے اور قرآن کے اِس معجزۂ فصاحت کے قائل ہو گئے۔ اب ہم قبل اسکے کہ قرآن کے اس خاص معجزے کو وضاحت سے بیان کریں فدائِ قوم سر سید احمد خانصاحب کی تقریر اس بارے میں گوش گذار کر دینا ضروری سمجھتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ اسمیں شک نہیں کہ قرآن مجید اعلیٰ درجہ کا فصیح و بلیغ ہی مگر یہ بات کہ اُسکی مثل کوئی نہیں کہہ سکا یا کہہ سکتا اسکے من اللہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی کسی کلام کی نظیر نہ ہونا اس بات کی تو بلاشبہ دلیل ہی کہ اسکے مانند کوئی دوسرا کلام موجود نہیں ہی مگر اسکی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کی طرف سے ہی۔ بہت سے کلام انسانوں کے دُنیا میں ایسے موجود

ہیں کہ اُن کی مثل فصاحت و بلاغت میں آجتک دوسرا کلام نہیں ہوا مگر وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے +

م - افسوس تو اس بات کا ہی کہ سید احمد اپنی عقل کے سامنے سب کی عقل کو گرد سمجھتے ہیں - یہی وجہ ہی کہ وہ صاف الفاظ میں لکھ رہے ہیں کہ آجتک علماء اسلام نے سُنی سنائی باتوں پر عمل کیا اور آبائی تربیت کے دام میں گرفتار رہے - کیوں نہیں یہ نئی تحقیقات آپ ہی کا حصہ تھا اسی پر آپکے حواری عقل کے دشمن آپکو جدید علم کلام کا بانی سمجھتے ہیں - بھلا ایک موٹی سی بات ہی کہ جتنے کلام اسوقت ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ انکا مثل دوسرا نہیں ملتا اُنکو اول سے آخر تک دیکھ جایئے کہیں بھی یہ دعویٰ نہ ملیگا کہ اسکا مثل کوئی نہیں بنا سکتا اور واقعی بات یہ ہی کہ بشر سے یہ دعویٰ ہو کب سکتا ہی - اہلِ کلام خواہ کیسا ہی زور کا کلام کیوں نہ تصنیف کرے لیکن اس خیال سے کہ آخر پھر بشر ہوں ہرگز اس دعوے کو زبان پر نہیں لاسکتا - اور اگر کسی ایک نے بھی یہ دعویٰ کیا ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ دُنیا بھر اُسکے برابر بنانے میں کوشش کرتی اور نہ بناسکتی - کیونکہ قاعدہ ہی کہ دعوے کے مقابل انسان کو ضد زیادہ ہوا کرتی ہی اور اُسکے باطل کرنے میں جان توڑ کوشش کرتا ہی - پھر جب کسی مصنف بیچارے نے یہ دعویٰ ہی نہیں کیا تو اُسکے مثل بنانے یا نہ بنانے کی بحث ہی فضول ہی - لطف تو اس کا ہی کہ باوجود ہزار مخالفت کے قرآن مجید میں یہ دعوی بہت زور سے کیا گیا کہ اسکی مثل ایک سورت بنا لاؤ - اہلِ عرب کی ضد اور مخالفت اسلام کے مقابلہ میں جیسی اُسوقت تھی سب جانتے ہیں کہ مال و اولاد سب ہلاک اور تباہ و برباد کر ڈالے تھے اور رات دن اسکے ابطال کی دُھن میں رہتے تھے یہ دعویٰ سُنکر کہ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ کیا کچھ جانفشانی اور جانکاہی نہ کی ہوگی - مگر باوجود اہل زبان ہونے اور قانونِ فصاحت و بلاغت پر پوری مہارت حاصل ہونیکے پھر عاجز رہے اور اسمیں شک نہیں کہ اگر قرآن اور اُن کے کلام میں معمولی تفاوت بھی ہوتا تو سب کے سب ملکر کوشش کرتے اور تھوڑا بہت ضرور بنا کر چھوڑتے - مگر یہاں تو قصہ یہ ہوا کہ ہزار سر مارا مگر نہ کسی

ایک سے نہ سب سے ایک آیۃ کی برابر بھی نہ بن سکا۔ اس سے صاف روشن ہوگیا کہ قرآن میں جو فصاحت ہی وہ طاقت بشری سے بالکل باہر ہی تو پھر کیوں نہ یہ فصاحت قرآن کے من اللہ ہونے کی زبردست دلیل سمجھی جاوے۔

اب سنیئے قرآن میں باوجود چند ایسی باتیں ہونیکے جو قرآن کی نقصان فصاحت کو مقتضی ہیں پھر بھی اُن کے ہوتے ہوئے قرآن اُسی درجہ کا فصیح و بلیغ ہی (۱) اہل عرب کی فصاحت کا خرچ زیادہ تر عورتوں اور بادشاہوں خاندانوں اور جنگ و جدال کی تعریف میں ہوا کرتا تھا تو ظاہر تو یہ تھا کہ جیسے الفاظ فصیح وہ اس قسم کے کلام میں استعمال کرتے تھے قرآن میں نہ آتے لیکن پھر بھی الفاظ قرآنی ویسے ہی فصیح و بلیغ ہیں (۲) اللہ تعالےٰ نے اِس کلام میں سچے مضامین بیان فرمائے ہیں۔ اور جو شاعر جھوٹ کو چھوڑکر سچے مضمون بیان کریگا اُسکا شعر نہ زورکا ہوگا اور نہ اُسمیں کچھ لطف آویگا جیسے ؎ چشمانِ تو زیر ابرواں اند + دندانِ تو جملہ در دہاں اند + اب بتائیے آپ کو اسمیں کیا لطف آیا۔ کچھ بھی نہیں۔ تو بات یہی ہی کہ بغیر جھوٹ کی آمیزش کے کسی مضمون میں لطف نہیں آسکتا۔ اِسی پر ایک بزرگ نے اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کی ہی کہ ؎ در شعر مپیچ و در فن او + چوں اکذب اوست احسن او + لبید بن ربیعہ اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہما کے اشعار بھی اسلام لانے پر اُس زور کے نہیں رہے تھے جیسے کہ اسلام لانے سے پہلے تھے لیکن کلام الٰہی باوجود سچا اور جھوٹ سے بالکل مبرّا و منزّہ ہونے کے پھر اُسی زور کا فصیح و بلیغ اور پر لطف ہی (۳) قاعدہ ہی کہ قصیدہ میں پہلا ایک دو شعر زیادہ زوردار اور اعلےٰ درجہ کے فصیح ہوتے ہیں۔ اور باقی اشعار اُس پلے کے نہیں ہوتے بلکہ معمولی ہوتے ہیں لیکن یہ کلام پاک سارا کا سارا یکساں فصیح ہی۔ جیسے کل کی برابر کوئی نہیں بنا سکتا ایسا ہی ایک آیۃ کی برابر کوئی نہیں بنا سکتا۔ چنانچہ کہیں یہ فرمایا کہ اگر تمام جن و انس جمع ہوں تو اِس قرآن کی مثل نہیں بنا سکتے۔ کہیں یہ ارشاد ہی کہ دس سورتوں کی برابر بنا لاؤ کہیں یہ کہ ایک ہی سورت کی برابر لے آؤ۔ غرضکہ اسطرح حجت تمام کرکے بالکل عاجز کردیا گیا اور کسی سے نہ کل کی برابر بن سکا

(۴) جب ایک چیز کی تعریف میں ایک دفعہ شعر فصیح کہا جاتا ہی تو پھر جب دوسری دفعہ اسکی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو وہ شعر مثل پہلے کے فصیح نہیں ہوتا مگر قرآن میں باوجود اسکے کہ ایک مضمون کئی کئی جگہ مذکور ہی پھر ہر ایک فصاحت میں مساوی درجہ کا ہی - اور ایک دوسرے میں ذرا تفاوت نہیں - (۵) یہ عجیب لطف کی بات ہی کہ جیسے ساد ے مضامین قران میں مذکور ہیں (عبادات کا واجب کرنا - بری باتوں سے روکنا - مکارم اخلاق کی تعلیم دینا - ترک دنیا اختیار آخرۃ کی حرص دلانا) اگران کو کوئی شاعر بیان کرنا چاہے خواہ نظم میں یا نثر میں تو ممکن نہیں کہ ان میں فصاحت کا نام بھی آجاوے لیکن اس کلام پاک میں یہ مضامین بھی ویسے ہی فصیح و بلیغ ہیں جیسے حسن و عشق حب دنیا - تعریف ملوک میں فصیح ہوتے ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ (۶) ہر ایک شاعر کو کسی نہ کسی خاص مضمون کے ساتھ مناسبت ہوا کرتی ہی جسمیں وہ اعلےٰ پیمانہ پر شعر کہہ سکتا ہی علاوہ اُس مضمون کے دوسرے میں ایسی تیزی سے طبیعت نہیں چلا کرتی جیسے مرزا سودا بہ نسبت اور مضامین کے ہجو بڑے زور کی لکھتے تھے اور ایسے ہی ہر ایک شاعر کا مذاق اور رجحان طبع کسی خاص مضمون کی طرف ہوتا ہی - کوئی حمد و نعت اچھّی لکھتا ہی کسی کو عشقیہ مضامین سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہی لیکن قرآن مجید میں جتنے قسم کے مضامین مذکور ہیں وہ سب کے سب برابر فصیح ہیں * غرضکہ یہ وجوہ اور خصوصیات ہیں جنکو دیکھ کر کہا جاتا ہی کہ قرآن کی فصاحت ہی اسکے من اللہ ہونے کی زبردست دلیل ہی اور سید احمد خاں بیچارے کیا پدی کیا پدی کا شوربہ - وہ جب اپنی کور چشمی سے قرآن مجید کو انسان کے کلام سے زیادہ نہیں دیکھ سکتے تو اسمیں ان کو کسی قسم کی خصوصیت انسانی کلام سے زیادہ کیسے نظر آسکتی ہی - مگر سہ

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم | چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝

پھر اگر نہ کروگے تم اور ہرگز نہ کروگے بس بچو آگ سے جسکا ایندھن ہے آدمی اور پتھر تیار کی گئی ہے واسطے کافروں کے

س - اس مقام و نیز دیگر مقامات پر وعدہ وعید دوزخ و بہشت کے جن الفاظ سے
بیان ہوئے ہیں اُنسے بعینہ وہ اشیاء مقصود نہیں ہیں بلکہ اُسکا بیان کرنا صرف اعلیٰ درجہ کی
خوشی و راحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لانا ہی - اس خیال سے اُسکے دلمیں بے انتہا
عمدگی نعیم جنت کی اور ایک ترغیب احکام کے بجالانے اور گناہوں سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے
جسکو کوڑ مغز مُلّا یا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت
خوبصورت اَن گِنت حوریں ملینگی - شرابیں پئیں گے - میوے کھاوینگے - دودھ شہد کی ندّیوں
میں نہاوینگے اور جو دل چاہیگا مزے اُڑاوینگے یہ سراسر لغو اور بیہودہ خیال ہے علماء اسلام نے
بسبب اپنی رقّت قلبی کے جو آدمی کو اِس درجہ تک پہونچا دیتی ہے کہ اصل حقیقت کے بیان کرنے
کی جراءت نہیں رہتی یہ طریقہ اختیار کیا کہ جو امر الفاظ سے مستفاد ہوتا ہے اُس کو تسلیم
کرلیں اور اُس کی حقیقت اور اُس کے مقصد کو خدا کے علم پر چھوڑ دیں اِس واسطے وہ
تمام اُن باتوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کو کوئی بھی نہیں مان سکتا (آگے چلکر فدائے قوم کہتے ہیں)
اصل یہ ہے کہ جب انسان کو ایک بات کے کرنے کو اور ایک بات کے نہ کرنے کو کہا جاوے
تو بالطبع انسان اُس کی منفعت اور مضرت کے جانے کا خواہاں ہوتا ہے اور بغیر جانے اُسکے
کرنے یا نہ کرنے پر راغب یا متنفر نہیں ہوتا - اِس واسطے ہر ایک پیغمبر کو بلکہ ہر ایک ریفارمر
یعنی مصلح کو اُس منفعت و مضرت کا کسی تمثیل یا تشبیہ سے بتانا پڑتا ہے - چنانچہ انبیاء نے
اُن راحتوں اور لذتوں یا رنج اور تکلیفوں کو جو انسان کے خیال میں ایسی ہیں جو اُن سے
زیادہ نہیں ہوسکتیں بطور جزا و سزا اُن افعال کے بیان کیا ہے - اور غرض اِن سے بعینہ
وہی اشیاء نہیں ہیں بلکہ جو رنج و راحت لذّت و تکلیف اُن سے حاصل ہوتی ہے اُسکو
تشبیہاً بیان کرنا مقصود ہے گو وہ تشبیہ کیسی ہی ادنےٰ اور ناچیز ہو - تمام انسان کو خواہ سرد
ملک کے رہنے والے ہوں خواہ گرم ملک کے مکان کی آراستگی - مکان کی خوبی - باغ کی خوشنمائی
بہتے پانی کی دلربائی میووں کی تر و تازگی سب کے دل پر ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہی اُسکے سوا

حُسن یعنی خوبصورتی سب سے زیادہ دل پر اثر کرنے والی ہے خصوصاً جبکہ انسان میں ہو اور اُس سے بھی زیادہ جبکہ عورت میں ہو۔ پس بہشت کی اِن راحتوں کو حور و غلمان نہر و شراب کی تشبیہ میں۔ اور دوزخ کے مصائب کو آگ میں جلنے اور لہو و پیپ پلانے اور تھوہر کھلائے جانے کی تمثیل میں بیان کیا ہے۔ اور یہ سمجھنا کہ جنّت مثل ایک باغ کے پیدا کی ہوئی ہے۔ اُس میں سنگ مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں باغ میں سرسبز و شاداب درخت ہیں دودھ شراب کی ندیاں بہہ رہی ہیں ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے ساقی و ساقنیں نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں شراب پلا رہی ہیں ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے۔ ایک نے ران پر سر دھرا ہے۔ ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے۔ ایک نے لب جاں بخش کا بوسہ لیا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ ایسا بیہودہ پن ہے جسپر تعجّب ہوتا ہے اگر بہشت یہی ہے تو بلا مبالغہ ہمارے خرابات اُس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔

م۔ ناظرین! دیکھا آپ نے کہ سید احمد خاں نے بہشت کی حقیقت اور اُسکی نعمتوں کو کس پھکّڑ پنے سے بیان کیا ہی۔ آپ کی تقریر پُر تزویر کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء نے للچا للچا کر عبادت کرانے کے لیے حور و غلمان۔ دودھ و شراب کی ندیوں کا ذکر کیا ہے ورنہ درحقیقت وہاں اِنمیں سے کوئی بھی چیز نہیں ہی۔ اب آپ خیال کیجیے کہ یہ انبیاء نے للچایا ہے یا خدا نے۔ اور اگر اِس سے صرف کام لینے کی غرض سے للچانا ہی مقصود ہے اور حقیقت اِسکی کچھ بھی نہیں ہی تو قرآن کی جسقدر آیتوں میں جنّت کا ذکر ہے کیا وہ سب دھوکہ کی ٹٹّی ہیں۔ استغفر اللہ۔ خدا سچّے کا کلام اور ایسا لغو اور مبالغہ آمیز نعوذ باللہ من ذٰلک۔ یہ نئی تہذیب کے بانی کی تہذیب ہی کہ بندوں سے گزر کر خدا اور خدا کے کلام کے ساتھ استہزار کرتا ہی مگر یاد رکھنا چاہیے کہ۔ اَللّٰہُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ اب ہم آپ کو وہ بعض آیات سُناتے ہیں جن میں صاف صاف جنت کی نعمتوں (مثل میوہ دار درخت۔ دودھ شہد کی نہریں۔ حور و

غلمان ا کا ذکر ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِیْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۚ۬ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَ لَهُمْ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ صفت اُس بہشت کی کہ وعدہ کیے گئے ہیں پرہیزگار اُسمیں نہریں ہیں پانی کی جو بو نہیں کر گیا اور نہریں ہیں دودھ کی جسکا مزہ نہیں بدلا اور نہریں شراب کی لذت دینے والی پینے والوں کو اور نہریں ہیں شہد صاف کیئے گئے کی اور اُن کے لیے وہاں میوے ہیں سب طرح کے اور بخشش ہی پروردگا اُن کے سے۔ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ حوریں بٹھائی ہوئی خیموں میں لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ۔ نہیں چھوا اُنکو کسی آدمی نے پہلے اور نہ کسی جن نے یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِیْقَ ۙ۬ وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ لَّا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَ لَا یُنْزِفُوْنَ وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ وَ لَحْمِ طَیْرٍ مِّمَّا یَشْتَهُوْنَ ؕ اور لیے پھرینگے اُن کے پاس ہمیشہ لڑکے رہنے والے آبخورے اور آفتابے اور پیالے صاف شراب کے کہ نہ اُس سے اُن کو سر درد ہوگا نہ اُس سے بہکیں گے۔ اور جس قسم کے میوے کہ وہ پسند کرینگے اور جس پرند کا گوشت کہ وہ چاہیں گے عٰلِیَهُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّ حُلُّوْۤا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ؕ اُن لڑکوں پر کپڑے ہیں باریک ریشم کے سبز اور گاڑھے اور اُن کو پہنائے جاوینگے کنگن چاندی کے اور پلاویگا اُن کو رب اُنکا شربت پاکیزہ ایسا ہی دوزخ کی حالت و کیفیت کو جناب باری عز اسمہ نے تفصیل سے بیان فرمادیا ہی جو بطور اختصار آپ کو سنایا جاتا ہی وَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ اِذَاۤ اُلْقُوْا فِیْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِیْقًا وَّ هِیَ تَفُوْرُ تَكَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ اور جن لوگوں نے کہ اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ہی اُن کو جہنم کا عذاب ہی اور کیا بری جگہ ہی جہنم قریب ہے کہ پھٹ پڑے غصے کے مارے اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِیْمِ

كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَى سَوَاءِ الْجَحِيمِ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ تحقیق زقوم کا درخت گنہگاروں کا کہانا ہی پگھلے ہوے تانبے کی مانند ہوگا پیٹ میں گرم پانی کے مانند جوش ماریگا دوزخی کے واسطے حکم ہوگا کہ اسکو پکڑو اور گھسیٹ کر بیچوں بیچ دوزخ میں لے جاو پھر اسکے سر پر گرم پانی کا عذاب ڈالو مِنْ وَرَائِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَى مِنْ مَاءٍ صَدِيدٍ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۖ وَمِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ - اور آگے اسکے دوزخ ہی اور پلایا جاویگا ایسا پانی کہ وہ پیپ ہوگی ایک ایک گھونٹ پیویگا اسکو لیکن گلے سے نہ اُتار سکیگا - اور آویگی اُسکو ہر جگہ سے موت لیکن نہ مریگا وہ اور آگے اُسکے ہوگا عذاب سخت -

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو میں بنانے والا ہوں زمین میں نائب

سید صاحب لکھتے ہیں کہ اس آیت سے وہ ذکر شروع ہوا ہی جو آدم کا قصہ کہلاتا ہی - تمام مفسرین اسکو ایک واقعی جھگڑا یا مباحثہ سمجھتے ہیں جو خدا اور فرشتوں میں ہوا - مَلَک کے معنی ایلچی یا پیغامچی کے ہیں - عبرانی - یونانی - فارسی میں جو لفظ ملک کے لیے ہی اُن سب کے معنی ایلچی کے ہیں جو خدا کا پیغام نبیوں کو پہونچاتا ہی - فرشتوں کے وجود کی نسبت لوگوں کے عجیب عجیب خیالات ہیں - انسان کی یہ ایک طبعی بات ہی کہ جب کسی ایسی مخلوق کا ذکر ہو جسکو وہ نہیں جانتا تو خواہ نخواہ اُسکے دل میں اُس مخلوق کے ایک جسمانی جسم متخیر کا جس کے رہنے کی کوئی جگہ بھی ہو خیال ہوجاتا ہی پھر اُن کے اوصاف خیال کرتے کرتے اُن کی ایک صورت جو اُن اوصاف کی مقتضی ہوتی ہی اُسکے خیال میں قرار پاتی ہی اور وہ پھر اُس بات کو تو بھول جاتا ہی کہ میں اُس مخلوق کو کچھ نہیں جانتا نہ میں نے اُسکو کبھی دیکھا ہی اور یوں جانے لگتا ہی کہ وہ مخلوق

نہی ہی جو میرے خیال میں ہی۔ اور جب وہ خیال لوگوں میں نسل در نسل چلا آتا ہے تو ایسا مستحکم ہو جاتا ہے کہ گویا اُس میں شک و شبہ مطلق ہے ہی نہیں۔ یہی حال فرشتوں کی نسبت ہوا ہی اُن کو نوری سمجھ کر گورا گورا اسفید برف کا رنگ۔ نوری شمع کی مانند با ہیں۔ بلور کی سی پنڈلیاں۔ ہیرے کے سے پائوں۔ ایک خوبصورت انسان کی سی شکل مگر مرد نہ عورت تصور کیا ہے۔ آسمان اُن کے رہنے کی جگہ قرار دی ہی۔ آسمان سے زمین پر آنے اور زمین سے آسمان پر جانے کے لیے اُن کے پر لگائے ہیں۔ اور کسی کو غصہ ور و غضبناک۔ کسی کو کم شان کا۔ کسی کو صور پھونکتا۔ کسی کو آتشین کوڑے سے مینہ برساتا خیال کیا ہی۔ عرب کے بُت پرست فرشتوں کو ایک مجسّم اور متحیز سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ نہ وہ کھاتے پیتے ہیں اور نہ کچھ بشری ضرورت اُن کو ہی۔ وہ آسمانوں پر رہتے ہیں اور زمین پر آتے جاتے ہیں عام مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے جو عرب کے بُت پرستوں کا تھا۔ وہ فرشتوں کو ہوا کی مانند لطیف اجسام سمجھتے ہیں۔ اور مختلف شکلوں میں سمانے کی اُن میں قدرت سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ آسمانوں پر رہتے ہیں اور پردار ہیں کہ اُڑ کر زمین پر اُترتے ہیں اور زمین پر سے اُڑ کر آسمان پر چلے جاتے ہیں اور چیلوں کی طرح آسمان اور زمین کے بیچ میں منڈلاتے ہیں۔

(سید صاحب نے جیسے جنت کی نعمتوں کو پھکڑپنے سے بیان کیا تھا ایسے ہی فرشتوں پر جو خدا کی ایک بزرگ مخلوق ہی اور اُن پر ایمان رکھنے والوں پر پھبتیاں اُڑائی ہیں اب آپ کا ذاتی عقیدہ سنیئے۔ لکھتے ہیں کہ) میں کہتا ہوں کہ خدا تعالے اپنی قدرت اور اپنے افعال کو فرشتوں سے نسبت کرتا ہے۔ اور جن فرشتوں کا ذکر قرآن میں ہے **اُن کا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا** بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور اُن قوائے کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوقات میں مختلف قسم کے پیدا کیے ہیں ملک یا ملائکہ کہتے ہیں۔ جن میں سے ایک شیطان یا ابلیس بھی ہے۔ پہاڑوں کی صلابت پانی کی رقت۔ درختوں کی قوت نمو برق کی قوت جذب و دفع غرضکہ تمام قوے جن سے مخلوقات موجود ہوئی ہے اور جو مخلوقات میں ہیں

وہی ملک یا ملئکہ ہیں۔ انسان ایک مجموعہ قویٰ ملکوتی اور قوئے بہیمی کا ہے اور ان دونوں قوتوں کی بے انتہا ذریات ہیں جو ہر ایک قسم کی نیکی و بدی میں ظاہر ہوتی ہیں اور وہی انسان کے فرشتے

اور اُس کی ذریات اور وہی انسان کے شیطان اور اُس کی ذریات ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان آیتوں میں خدا تعالےٰ انسان کی فطرت کو اور اُس کے جذبات کو بتلاتا ہے۔ اور جو قویٰ بہیمیہ اُس میں ہیں اُن کی بُرائی یا اُن کی دُشمنی سے اُس کو آگاہ کرتا ہے مگر یہ ایک نہایت دقیق راز تھا جو عام لوگوں اور اونٹ چرانے والوں کی فہم سے بہت دور تھا اس لیے خدا نے انسانی فطرت کی زبان حال سے آدم و شیطان کے قصے یا خدا اور فرشتوں کے مباحثہ کے طور پر بیان کیا ہے۔ تاکہ ہر کوئی خواہ اُس کو فطرت کا راز سمجھے یا فرشتوں اور خدا کا مباحثہ خواہ شیطان و خدا کا جھگڑا۔ توریت میں لکھا ہے کہ خدا نے فرشتوں سے کہا کہ آؤ ہم آدمی کو اپنی صورت پر بناویں یہ مضمون مسلمان مفسروں کے دل میں تھا اور وہ اُس کو مثل یہودیوں کے ایسا ہی سمجھ رہے تھے جیسے کہ ایک آدمی سے ایک آدمی بات کرتا ہے اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ کو اُنہوں نے ویسا ہی سمجھا اور آدم و شیطان کا قصہ بنا لیا نعوذ باللہ من ھٰذہ المفتریات التی افترٰھا سید احمد خان۔

۴۔ سید احمد خاں نے ایک خیالی ڈھکوسلہ بگھار کر یہ لکھ دیا کہ اِس آیت کے جو معنی مسلمان مفسرے رہے ہیں وہ یہودیوں سے سُنے ہوئے ہیں۔ ورنہ دراصل یہ انسان کے قوئے ملکوتی کو قوئے بہیمیہ کی بُرائی سے آگاہ کرتا ہے۔ اور اونٹ چرانے والوں کو سمجھانے کی غرض سے ایک قصے کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا ہم فرض سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید میں سے وہ آیتیں جن میں فرشتوں کا ذکر ہے اور اُن سے فرشتوں کی قسمیں بھی معلوم ہوتی ہیں درج کریں دیکھیں سید احمد خاں کے پیروان کی کیا تاویل کرتے ہیں۔

(۱) عرش کے اُٹھانے والے — وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ

(۲) عرش کے گھیرنے والے — وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ

۳ - جنت کے فرشتے — وَالْمَلٰئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ

۴ - دوزخ کے فرشتے — عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ وَمَا جَعَلْنَا اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰئِكَةً

(دوزخ کے فرشتوں کا نام زبانیہ ہے فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ - اوران کا سردار مالک ہے - نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ -

۵ - بنی آدم کی حفاظت کرنے والے اور اعمال لکھنے والے — اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً -

۶ - احوالِ دنیا کی خبر رکھنے والے — وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا -

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ علاوہ حافظین کے اللہ کے اور فرشتے ہیں جو درخت کے پتے کے گرنے تک کو لکھتے ہیں - پس اگر تم کو کسی ویران جنگل میں کوئی دشواری پیش آوے تو اس طرح آواز دینی چاہیئے اَعِيْنُوْا يَا عِبَادَ اللّٰهِ يَرْحَمُكُمُ اللّٰهُ (مدد کرو اللہ کے بندو اللہ تم پر رحم فرمائے) سب سے افضل اور مقرب چار فرشتے ہیں - جبرئیل - میکائیل - اسرافیل - عزرائیل - دو فرشتوں جبرئیل و میکائیل کی فضیلت تو قرآن مجید سے معلوم ہوتی ہے مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكَالَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ جبرئیل علیہ السلام میکائیل سے بھی افضل ہیں - چنانچہ آیۃ میں پہلے جبرئیل ہی کا ذکر ہے اور اسکی وجہ بھی خاص ہے اور وہ یہ کہ جبرئیل صاحب الوحی والعلم ہیں اور میکائیل صاحب الارزاق ہیں - اور علم غذاء روحانی ہے جسکا غذاء جسمانی پر افضل ہونا ظاہر ہے اسلیئے جبرئیل میکائیل سے افضل ہوئے - اور اسرافیل و عزرائیل علیہما السلام کا وجود اور انکی فضیلت حدیث شریف سے معلوم ہوتی ہے - آیۃ قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ میں ملک الموت سے مراد حدیث کے موافق عزرائیل علیہ السلام ہیں - اور نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ میں نفخ صور کرنے والے حضرت

اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ جمہور اہل اسلام کے نزدیک فرشتوں کی تعریف یہی ہے کہ وہ اجسام لطیفہ ہوائیہ ہیں کہ جو مختلف شکل بدلنے پر قادر ہیں اور اُن کا مسکن آسمان ہے۔ سید احمد خاں نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض بکواس ہی بکواس ہے۔ ہم انشاء اللہ تعالے اسی ایک موقع پر جہاں فرشتوں کا ذکر آویگا ایسا ہی ثبوت نقلی پیش کرینگے۔

اسی بحث میں سید احمد خاں نے یہ بھی لکھا ہے کہ۔ اگر فرض کریں کہ فرشتے اور شیطان ایک علیحدہ وجود رکھتے ہیں جیسے کہ عموماً مسلمانوں کا عقیدہ ہے تو بھی یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا فی الواقع یہ مباحثہ خدا اور فرشتوں میں ہوا تھا کیونکہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے خدا سے مباحثہ نہیں کر سکتے بلکہ اُسکے حکم کو بجالاتے ہیں۔ خدا نے فرمایا ہے وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ یعنی کافروں نے کہا کہ خدا نے بیٹا بیٹی بنائے ہیں حالانکہ وہ اُس سے پاک ہے بلکہ (جنکو وہ بیٹا بیٹی کہتے ہیں وہ) معزز بندے ہیں خدا سے آگے بڑھکر بات نہیں کہتے اور جو وہ کہتا ہے وہی کرتے ہیں۔ اس آیت سے فرشتوں کو مجال مباحثہ خدا سے معلوم نہیں ہوتی پھر کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ فی الواقع فرشتوں نے خدا سے مباحثہ یا جھگڑا ٹنٹا کیا تھا۔ ناظرین! اگر آج سید احمد خاں زندہ ہوتے تو ہمارا اُنکا اِسی آیت پر فیصلہ تھا وہ لکھتے ہیں کہ۔ اگر فرض کر لیں کہ فرشتے ایک علیحدہ وجود رکھتے ہیں تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُنھوں نے خدا سے مباحثہ کیا ہو کیونکہ وہ خدا سے مباحثہ نہیں کر سکتے بلکہ اُسکے حکم کو بجالاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر فرشتوں کا علیحدہ وجود فرض نہ کریں اور آپکے قول کے موافق اُن کو قوے سے تعبیر کریں تو اِس آیت میں عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ جسکا ترجمہ آپنے بھی معزز بندے کیا ہے کون مراد ہونگے واللہ یہ ایک ایسی بات ہے کہ سید احمد خاں سنتے ہی اٰمنت باللہ وملٰئکتہ پڑھتے مگر اب ہمکو نہایت افسوس کے ساتھ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ پڑھنا پڑتا ہے۔ یہ سید احمد خاں کی چال ہے کہ جب

اس آیت میں معزز بندے کی کوئی تاویل نہ گھڑی گئی تو اُسکو اِس انداز سے لکھ گئے کہ اگر کوئی فرشتوں پر ایمان بھی رکھتا ہو تو کم سے کم اُسکے دل میں یہی شبہ پڑجائے کہ اُنھوں نے خدا سے مباحثہ کیوں کیا۔ مگر ناظرین آپ یہ خوب خیال فرمالیں کہ یہ مباحثے اور جھگڑے ٹنٹے کے الفاظ بھی سید احمد خاں ہی لکھتے ہیں لیکن درحقیقت یہ نہ مباحثہ ہی اور نہ جھگڑا ٹنٹا۔ بلکہ بات صرف اتنی ہی کہ باری تعالیٰ نے جس خدمت کیلئے آدم ؑ کو پیدا کرنے کا اظہار فرمایا تھا اُسکے بجالانے کی فرشتوں نے درخواست کی تھی۔ اور یہ فرشتوں کی غایت اطاعت و فرمانبرداری کا مقتضے تھا۔ سید احمد خاں اِسکو ایسا جھگڑا سمجھ گئے جیسا عدالت میں کسی اسامی خالی ہونے کے وقت ہوا کرتا ہی خصوصاً اُسوقت کہ جب حاکم عدالت کسی نئے امیدوار کو اُسپر رکھنا چاہتا ہی تو پُرانے ملازم یہ سُنکر واویلا اور آہ و فریاد کیا کرتے ہیں کوئی کہتا ہی کہ حضور میری سروس کو ملاحظہ فرمائیں کوئی کہتا ہی میرے اعمالنامے کا معائنہ ہوجائے۔ میں سرکار کا پُرانا نمکخوار اور خیرخواہ ہوں میں اس کام کو نہایت عمدگی سے انجام دے سکتا ہوں۔ ہمارے ہوتے یہ اسامی نئے امیدوار کو ملنے میں بڑی حق تلفی ہی اور وہ امیدوار تو بالکل نیا اور عدالت کے کام سے بالکل ناواقف ہی۔ وفعتہ اِس عہدے کے قابل نہیں ہی۔ حضور یہ خیال فرمالیں کہ اِس میں اِس عہدہ کی قابلیت نہ ہونے سے کارِ سرکار میں بھی بہت بڑی بے عنوانی اور بدنظمی واقع ہوگی۔ غرضکہ ترقی تنخواہ اور عزت کی ہوس میں وہ اپنے آپکو ہر طرح سے اُس بیچارے پر ترجیح دیا کرتے ہیں اور حاکم کو عجیب پیچ و تاب میں ڈال دیتے ہیں سو فرشتوں کا یہ منشا نہیں تھا۔ اُنھوں نے اس نئی خدمت کو سُنکر اپنی مستعدی کا اظہار کیا تھا اور ظاہر ہی کہ خدام کا ہر خدمت پر اپنی مستعدی ظاہر کرنا اُنکی جاں نثاری و فرمانبرداری اور خیرخواہی کی دلیل اور آقا کے لیئے دل خوش کُن ہوتی ہی۔ اور کسی خدمت کو سُنکر خاموش اور ششدر رہ جانے اور نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا اوپر کر لینے سے بُزدلی۔ کم ہمتی۔ اور جان چُرائی معلوم ہوا کرتی ہی پس اب بالکل صاف ہوگیا کہ فرشتے واقعی خدا کے معزز بندے ہیں اُس سے آگے بڑھکر بات نہیں کرسکتے

جو اُس کا حکم ہوتا ہی بسر و چشم بجا لاتے ہیں لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ انکی صفت ہی اور
یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ اُن کا کام ہی + اب ایک بات اور رہی جاتی ہی ذرا آپ بھی غور فرمائیں
سید صاحب نے اس بحث کے شروع میں لکھا ہی کہ مَلَک کے معنی ایلچی یا پیغامچی کے ہیں ۔ عبرانی ۔ یونانی
فارسی میں جو لفظ ملک کے لیئے ہی اُن سب کے معنی ایلچی کے ہیں جو خدا کے پیغام نبیوں کو پہنچاتا
ہی مگر افسوس کہ اپنی تفسیر میں نہ کہیں ان معنوں کو چسپاں کیا اور نہ انکی تغلیط کی ۔ کیونکہ بقول
خواجہ صاحب حالی آپ کو اپنی رائے پر وثوق بہت کچھ تھا اگر ان معنوں کی غلطی ثابت کر دیتے
تو جب بھی حجت تمام تھی ۔ مگر آپ لکھنا تو لکھ گئے پھر خیال نہیں ہوا کہ اپنے ہاتھوں آپ
کلہاڑی مار چکا ہوں ۔ علاوہ اسکے یہ جو فرشتوں کی نسبت تمسخر آمیز کلمات لکھے ہیں اسکے
مقابلے میں سوائے اسکے کہ ہم ایک دو حدیث نقل کر دیں اور کیا کہہ سکتے ہیں ۔ حضرت
اُم المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہی کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ میں تم کو تمھاری اصل صورت پر دیکھنا چاہتا ہوں
حضرت جبریل ؑ نے جواب دیا کہ آپ فلاں وقت رات کو میدان میں تشریف لائیے تاکہ
کچھ اپنی اصلی صورت آپ کو دکھا دوں ۔ آپ اسی وقت معین پر اُس میدان میں تشریف
لے گئے ۔ آپنے دیکھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام آسمان کی طرف سے لباس سندس
پہنے ہوئے کہ اُسپر مروارید و یاقوت و زبرجد جڑے ہوئے ہیں اور چھ سو پر ہیں اور وہ
پر سب کے سب زبرجد و یاقوت و مروارید سے جڑے ہوئے ہیں ۔ اور لیجئے ۔ ایک روز
چاندنی رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لیجاتے تھے کہ اچانک حضرت جبرئیل
علیہ السلام نہایت آب و تاب و چمک دمک کے ساتھ ظاہر ہوئے ۔ آپ دیکھتے ہی بیہوش
ہو گئے ۔ جب ہوش آیا تو آپنے دیکھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام آپ کا سر مبارک اپنے سینہ
پر اور ایک ہاتھ اپنا آپکے سینہ مبارک پر اور دوسرا ہاتھ آپکے مونڈھوں کے درمیان
رکھے ہوئے بیٹھے ہوئے ہیں ۔ اور پوچھتے ہیں کہ آپ کیوں بیہوش ہو گئے آپنے فرمایا

کہ میں ہرگز گمان نہیں کرتا تھا کہ کوئی چیز مخلوقات میں اسقدر تاباں و درخشاں ہوگی - حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ اگر آپ اسرافیلؑ کو دیکھیں کہ ایک پر مشرق میں اور ایک مغرب میں تو آپ بڑا تعجب کریں اور باوجود اسقدر طول و عرض وجثہ کے بعض وقت بسبب تجلی عظمت الٰہی کے سکڑ کر چھوٹی چڑیا کے مانند ہو جاتے ہیں

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ

اور جب ٹکڑے کیا ہم نے واسطے تمہارے دریا کو پس بچا دیا ہمنے تمکو اور ڈبا دیا ہمنے فرعون کے لوگوں کو اور تم دیکھتے تھے

س ! سورہ بقرہ میں اس مقام پر جو واقعات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بیان ہوئے ہیں اُن میں سے واقعہ عبور بحر اور غرق فرعون قابل غور کے ہی - تمام مفسرین حضرت موسیٰؑ کے عبور بحر اور فرعون کے غرق ہونے کو بطور ایک ایسے معجزے کے قرار دیتے ہیں جو خلاف قانون قدرت واقع ہوا ہو جسکو انگریزی میں (سپر نیچرل) کہتے ہیں - اور یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے سمندر پر اپنی لاٹھی ماری وہ پھٹ گیا اور پانی مثل دیوار کے یا پہاڑ کے اِدھر اُدھر کھڑا ہو گیا - اور پانی نے بیچ میں خشک راستہ چھوڑ دیا - اور حضرت موسیٰ اور تمام بنی اسرائیل اُس راستہ سے پار اُتر گئے - فرعون بھی اُسی راستہ میں دوڑ پڑا اور پھر سمندر ملگیا - اور سب ڈوب گئے - سمندر میں راستہ ہو جانے کی نسبت قرآن مجید میں تین جگہ ذکر آیا ہی - اول سورہ بقرہ میں جہاں فرمایا ہی کہ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ دوم سورہ شعراء میں جہاں فرمایا ہی کہ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ تیسرے سورہ طٰہٰ میں جہاں فرمایا ہی فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا الخ - پہلی آیت میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں ہی جس سے سمندر کے جدا ہو جانے یا پھٹ جانے کو خلاف قانون قدرت قرار دیا جا سکے - دوسری آیت میں جو الفاظ ہیں اُنہی پر تمام مفسرین کا دار و مدار ہی وہ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ کے یہ معنے لیے

ہیں کہ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ سمندر کو اپنی لاٹھی سے مار چنانچہ حضرت موسیٰ نے لاٹھی ماری اور سمندر ہٹ گیا یا پھٹ گیا یا سمندر کی تہ زمین کھل گئی وہ اِس جملہ کو اسطرح پر بطور شرط جزا کے قرار دیتے ہیں کہ شرط گویا علت ہی اور جزا اُسکا معلول یعنی لاٹھی مارنے کے سبب سے سمندر پھٹ گیا اور زمین نکل آئی مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہی اِنْفَلَقَ ماضی کا صیغہ ہی اور عربی زبان کا یہ قاعدہ ہی کہ جب ماضی جزا میں واقع ہوتی ہی تو اُسکی دو حالتیں ہوتی ہیں اگر ماضی اپنے معنوں پر نہیں رہتی بلکہ شرط کی معلول ہوتی ہی تو اُسوقت اُسپر "ف" نہیں لاتے۔ اور جبکہ وہ اپنے معنوں پر باقی رہتی ہی اور جزا کی معلول نہیں ہوتی۔ تب اُس پر "ف" لاتے ہیں جیسے کہ اس مثال میں ہی۔ "ان اکرمتنی فاکرمتک امس" یعنی اگر تعظیم کرے گا تو میری تو میں تیری تعظیم کل کرچکا ہوں۔ اس مثال میں جزا (یعنی گذشتہ کل میں تعظیم کا کرنا) شرط کی معلول نہیں ہی کیونکہ وہ اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ اِسی طرح اس آیت میں سمندر کا پھٹ جانا یا زمین کا کھل جانا ضرب کا معلول نہیں ہو سکتا۔

م۔ اب بتائیے ناظرین سید صاحب کی اس کوتاہ نظری کو کیا کریں۔ آپنے لکھدیا کہ پہلی آیت میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں ہی جس سے سمندر کا جدا ہوجانا یا پھٹ جانا معلوم ہوتا ہو حالانکہ اِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ کے معنی صاف ہیں کہ ہم نے تمھارے لیے سمندر کے ٹکڑے کر دیے اُنکے ذہن میں ایک فرضی قاعدہ سمارہا تھا اُسکے جلدی سے بیان کرنے میں فَرَقْنَا کے معنی کو نہ دیکھ سکے اور غضب تو یہ کیا کہ اس فرضی قاعدے سے بھی دوسری آیت کے صرف اس ٹکڑے اَنِ اضْرِبْ بِعَصَاکَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ پر زور لگاتے رہے اور دوسرے حصہ فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ کو بالکل نسیًا منسیًا کر بیٹھے جس سے ایک اعلےٰ درجہ کی دھوکہ دہی معلوم ہوتی ہی۔ آپ یہ سمجھتے تھے کہ مرے مقلدوں کی طرح سب کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہی۔ کسی کو اصل معاملہ کا پتہ نہ چلیگا۔ یہ خبر نہ تھی کہ کلام الٰہی کے سچے اور صحیح معنی بیان کرنے والے۔ میری ایلہ فریبیوں کا راز فاش کرنے والے ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہینگے۔ آپنے کھینچ تان کر نصف آیت کے یہ تو

معنی بنالیے کہ موسےٰ کے آنے سے پہلے ہی سمندر خشک ہو رہا تھا ضرب عصا سے نہیں ہوا جیسے کہ
آپ کی آنکھوں کی مثال سے ظاہر ہوتا ہی مگر رہ رہ کر افسوس یہ ہوتا ہی کہ ذرا آگے بھی تو چلے
ہوتے بخدا اگر ایک قدم بھی آگے بڑھاتے تو اس بحر ذخار کی پتھر شکن موجیں ایسا چکر میں ڈالتیں
کہ آپ بہت جلد فرعون کی طرح مع خیالی لشکر کے تہ و بالا ہو کر غرق ہو جاتے ۔ اور ہم کھڑے
تماشا دیکھتے ۔ واضح رہے کہ اس آیت پر واقعی تمام مفسرین کا دار و مدار ہی ۔ اور اس سے
پوری طرح ثابت ہو رہا ہی کہ موسیٰ علیہ السّلام کے عصا مارنے سے سمندر پھٹا اور اسکا ہر
ٹکڑا مثل ٹیلے یا دیوار کی کھڑا ہو گیا آپ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ فَ جزاء پر آیا کرتی ہی
اسلیئے خود ہی یہ سمجھ لیا کہ علمار نے بھی یہاں شرط جزا قرار دی ہیں ۔ واہ جناب وا ۔ اسی
بوتے پر تفسیر لکھنے پر قلم اُٹھایا تھا ۔ کم از کم صرف و نحو سے تو واقفیت حاصل کر لی ہوتی ۔ خیر اب
آگے چلیے ۔ فدائی قوم کہتے ہیں کہ اصل یہ ہی کہ یہودی اس بات کے قائل تھے کہ حضرت موسےٰ علیہ السّلام
کے لاٹھی مارنے سے سمندر پھٹ گیا تھا اور زمین نکل آئی تھی اور لاٹھی مارنے سے پتھر میں سے
پانی بہ نکلا تھا علمار اسلام تفسیروں میں اور خصوصًا بنی اسرائیل کے قصوں میں یہودیوں کی
پیروی کرنیکے عادی تھے اور قرآن مجید کے مطالب کو خواہ مخواہ کھینچ تان کر یہودیوں کی
روایتوں کے موافق کرتے تھے اسلیئے اُنھوں نے اس جگہ بھی اور وہاں بھی جہاں قرآن میں
آیا ہی فَاضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۔ ضرب کے معنی زدن
کے لیئے اور اس سادھی سیدھی بات کو ایک معجزہ خارج از قانون قدرت بنا دیا ۔ اس
مقام پر ضرب کے معنی زدن کے نہیں ہیں بلکہ چلنے کے یا جلد چلنے کے ہیں جیسا کہ عرب بولتے
ہیں ضرب فی الارض چلا یا دوڑا زمین پر خود قرآن مجید میں آتا ہی إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ
فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ یعنی جب تم چلو زمین پر یعنی سفر کرو تو کچھ
حرج نہیں ہی کہ نمازوں میں قصر کرو پس صاف معنی یہ ہیں کہ خدا نے حضرت موسیٰ ؑ سے کہا کہ
اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں چل وہ پھٹا ہوا یا کھلا ہوا ہی یعنی پایاب ہو رہا ہی

پس جو کچھ تھا وہ یہی تھا کہ اس شکل کے وقت پایاب ہونے سے خدا تعالےٰ نے موسیٰ کو
تمام بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجے سے بچالیا اور جب فرعون نے پایاب اُترنا چاہا تو ا...
پانی بڑھ گیا تھا وہ مع اپنے لشکر کے ڈوب گیا۔

م۔ اب آپکو ضرب کے معنی چلنے کے بیان کرکے یہ خیال ہوا کہ یہاں ضرب کا صلہ
فی ہی اور اس صلہ سے ضرب کے معنی چلنے کے ہوتے ہیں اسپر بڑا بھاری اعتراض ہوگا کیونکہ
اس آیت میں ضرب کا صلہ فی نہیں ہی۔ اسلیئے اس اعتراض کے اُٹھانے کو بہت کچھ زور
لگایا ہی اور جوڑ توڑ کرکے اِسکی تقدیر اِضْرِبْ بِعَصَاكَ فِي الْحَجَرِ بتائی ہی جسمیں حرف ب کو
زائد قرار دیکر اصل صلہ فی مقدر نکالا ہی۔ افسوس صد افسوس یہ قاعدہ تو امسیں سے بھی بڑھ
گیا ایسے ہی عربی قاعدوں میں اُلٹ پلٹ کرنے سے آپنے جدید علم کلام بنایا ہی اسی پر آپکی
تفسیر کے مفسر خواجہ الطاف حسین صاحب حالی بڑے فخر سے لکھتے ہیں کہ سرسید نے جدید علم
کلام کی بنیاد ڈالی سچ ہی ؎ اگر نسطح زمین عقل منعدم گردد + نگو یہیچ کسے درجہاں کہ نادم
سیدھی بات ہی کہ جب ضرب کا صلہ فی ہوتا ہی تو اُسکے معنی چلنے کے آتے ہیں اور جب صلہ ب
ہوتا ہی تو اُسکے معنی مارنے کے آتے ہیں۔ کما قال تعالےٰ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا۔ پس بلا شبہ
اِنِ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ میں مارنے کے معنی ہیں اب مجال نہیں کہ کوئی اس معنی کے سامنے
دم مار سکے آپ اور سینئے ضرب سے پیچھے چھڑا کر سید احمد خاں کو یہ وہم ہوا کہ میں نے جوں توں
کرکے یہ تو ثابت کردیا کہ حضرت موسیٰ ع کے آنے سے پہلے سمندر خشک ہوگیا تھا لیکن اسپر پھر کوئی
یہ سوال کرسکتا ہی کہ حضرت موسیٰ ع کے آنے سے پہلے سمندر خشک ہوجانے میں بھی تو ایک قسم کا
معجزہ ظاہر ہوتا ہی کہ خدا نے اُنکی خاطر سے اُنکے آنے سے پہلے سمندر کو خشک یا پایاب کردیا تھا
تو اس سوال کا خود ہی اسطرح جواب دیتے ہیں "معلوم ہوتا ہی کہ اس وقت بہ سبب جوار بھاٹے
کے جو سمندر میں آتا رہتا ہی اس مقام پر کہیں خشک زمین نکل آتی تھی اور کہیں پایاب رہ جاتی
تھی بنی اسرائیل پایاب و خشک راستے سے راتوں رات پار اُتر گئے۔ صبح ہوتے فرعون نے جو دیکھا

کہ بنی اسرائیل پار اتر گئے اُسنے بھی ان کا تعاقب کیا اور لڑائی کی گاڑیاں اور سوار اور پیادے
غلط راستے پر سب دریا میں ڈال دیئے اور وہ وقت پانی کے بڑھنے کا تھا۔ لحہ لمحہ میں پانی بڑھ گیا
جیسے کہ اپنی عادت کے موافق بڑھتا ہے اور ڈباؤ ہو گیا جسمیں فرعون اور اُسکا لشکر ڈوب گیا" چلو
قصہ طے ہو گیا جوار بھاٹے سے دریا اُترا ہوا تھا اور کوئی بات نہیں تھی مگر اس عقل کے دشمن
کو یہ نہ سوجھا کہ جب سمندر کھلا ہوا یا پھٹا ہوا تھا تو عصا کے سہارے سے چلنے کی کیا ضرورت تھی
عصا کے سہارے سے کھڑے تو ہوا کرتے ہیں لیکن بلا کسی عذر کے چلا کوئی نہیں کرتا چنانچہ خود حضرت
موسیٰ علیہ السلام نے بھی جناب باری کے دریافت فرمانے پر یہی عرض کیا تھا قَالَ ھِیَ عَصَایَ
اَتَوَکَّأُ عَلَیْھَا الخ
اب آپ اصل قصہ سنیئے جسوقت اللہ جل جلالہ کا ارادہ فرعون کے غرق کرنے کا ہوا اور یہ
معلوم ہو گیا کہ وہ اور اُسکے حواری میں سے کوئی ایمان نہ لاویگا تو جبرئیل علیہ السلام رات کے وقت
نازل ہوئے اور موسیٰ علیہ السّلام سے کہا کہ اپنی قوم کو رات کو لے چلو۔ کما قال تعہ وَاَوْحَیْنَا
اِلٰی مُوْسٰی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ بنی اسرائیل کی تعداد اُسوقت چھ لاکھ تھی کیونکہ یہ حضرت یعقوب
علیہ السلام کے بارہ لڑکوں کے بارہ خاندان میں سے تھے اور ہر ایک کی تعداد پچاس ہزار
تھی پس جسوقت موسیٰ علیہ السّلام بنی اسرائیل کو لے نکلے تو یہ خبر فرعون کو پہنچی۔ اُسنے یہ خبر سنتے
ہی اعلان کر دیا کہ تا وقتیکہ مُرغ نہ بولے اُن کا پیچھا نہ کرو۔ خدا کی قدرت کہ صبح ہو گئی مگر اُس رات
مرغ نہ بولا جب صبح ہو گئی فرعون نے ایک بکری منگائی اور اُسکو ذبح کر کے کہا کہ میں اس بکری
کے جگر کھانے سے فارغ نہ ہونے پاؤں جو میرے پاس لشکر جمع ہو جائے۔ فرعون کا یہ کہنا تھا
کہ بارہ لاکھ آدمی جمع ہو گئے جو بڑے بڑے زبردست اور چالاک گھوڑوں پر سوار تھے۔ پھر
موسیٰ علیہ السلام کا دن نکلتے وقت تعاقب کیا۔ کما قال اللہ تعالےٰ فَاَتْبَعُوْھُمْ مُّشْرِقِیْنَ
یعنی بعد طلوع شمس کے اُن کا پیچھا کیا فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ
پھر جب دونوں لشکروں نے آپسمیں ایک دوسرے کو دیکھ لیا تو قوم موسیٰ نے عرض کیا کہ ہم اب

پکڑے جاوینگے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ - ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے مجھے عنقریب رستہ دکھادیگا - پس جبکہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو دریا کے قریب لے پہنچے تو یوشع بن نون نے عرض کیا کہ آپ کو آپکے رب نے کہاں کا حکم دیا ہے - حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس طرف کو - اور دریا کی طرف اشارہ کیا - یہ سنتے ہی یوشع بن نون نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈالدیا اور چلتے رہے یہاں تک کہ پانی ڈباو آگیا اور گھوڑا تیرنے لگا پھر یوشع لوٹے اور کہا اے موسیٰ آپکے رب نے آپکو کہاں کو حکم دیا ہے - فرمایا دریا میں کو - یوشع نے کہا کہ بخدا آپ جھوٹ نہیں بولتے پھر گھوڑا دریا میں ڈالا اور راستہ نہ پایا - پھر لوٹے - غرضکہ تین مرتبہ اسی طرح ہوا - پھر اللہ جل شانہ عم نوالہ نے موسیٰ کی طرف وحی کی - جیسا کہ فرماتے ہیں وَ اَوْحَیْنَا اِلٰی مُوْسٰی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ - یعنی ہم نے موسیٰ کیطرف وحی کی کہ تو اپنا عصا دریا میں مار - موسیٰ کا دریا میں عصا مارنا تھا کہ دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کے برابر ہوگیا چونکہ بنی اسرائیل کے بارہ حصہ تھے اسلیئے دریا کے بھی بارہ حصے ہوگئے اور ہر ایک کے لیئے رستہ جدا جدا ہوگیا پھر اُنہیں داخل ہوئے تو کیچڑ ہو رہی تھی خدائیتعالے نے ہوا چلائی جس سے وہ کیچڑ فوراً خشک ہوگئی اور ہر ایک راستہ خشک ہوگیا - کما قال فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا - غرضکہ اس طرح بنی اسرائیل بفضلہ تعالے دریا سے پار ہوگئے - فرعون جب دریا کے کنارے پہونچا تو ابلیس نے بصورت انسان ہوکر فرعون کو دریا میں داخل ہونے سے منع کیا اُسکے کہنے سے فرعون کا ارادہ ہوا کہ دریا میں داخل نہ ہوں مگر فوراً جبریل علیہ السلام ایک سوار کی صورت میں برابر سے نکلے اور دریا میں داخل ہوئے یہ دیکھ کر فرعون کا گھوڑا بھی پیچھے ہولیا پس جب فرعون دریا میں داخل ہوچکا حضرت میکائیل علیہ السلام پہنچے اور آواز دی کہ تم اگلے پچھلے سب اکٹھے ہوکر دریا میں داخل ہو یہ سنتے ہی سب دریا میں ایک دفعہ ہی گھس گئے اور اللہ تعالے نے پانی کو حکم دیا کہ بہم

ہو جا یہ حکم ہوتا تھا کہ پانی نے برابر ہو کر فرعون کو مع اُسکے لشکر کے غرق کر دیا پس اِس آیت کا یہ حاصل ہی وَاَغۡرَقۡنَا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ - یعنی ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے اور یہ عاشورہ کا دن تھا پس موسیٰ علیہ السلام نے اُس دن شکریہ کا روزہ رکھا۔

وَظَلَّلۡنَا عَلَیۡکُمُ الۡغَمَامَ وَاَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰی

اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا — اور اُتارا تم پر — من — اور — سلویٰ

س - توریت میں بنی اسرائیل پر بادلوں کے چھاؤں ہونے کا واقعہ عجیب طرح لکھا ہی کہ بادل تمام دن بنی اسرائیل کو راہ دکھانے کے لیے اُن کے آگے آگے چلتا تھا اور جہاں ٹھیر جاتا تھا وہاں بنی اسرائیل قیام کرتے تھے اور رات کو وہی بادل روشنی کا ستون ہو جاتا تھا علماء مفسرین نے بھی اپنی عادت کے موافق یہودیوں کی پیروی کی ہی اور اس آیت کی تفسیر میں اسی قسم کی باتیں بیان کی ہیں حالانکہ صرف اتنا معلوم ہوتا ہی کہ کسی وقت دھوپ اور گرمی کی سختی میں بادل آجانے سے اُنکی تکلیف کو دُور کر دیا - جسکو بطور احسان کے ذکر کر دیا ہی بڑی غلطی لوگوں کے خیال میں یہ ہی کہ انہیں ایسی باتیں شامل کر لیتے ہیں جو قانون قدرت سے خارج ہیں -

م - ظَلَّلۡنَا عَلَیۡکُمُ الۡغَمَامَ - اے جَعَلۡنَا الۡغَمَامَ لِظِلِّکُمۡ یعنی ہم نے تمھارے سایہ کے واسطے بادل کر دیا - اور یہ واقعہ وادی تیہ کا ہی اسکا قصہ اس طرح ہوا تھا کہ بنی اسرائیل دراصل ملک شام کے رہنے والے تھے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصر میں آئے اور وہیں رہنے لگے - شام پر ایک قوم عمالقہ کا تسلط ہو گیا جب زمانہ موسیٰ علیہ السلام میں فرعون کے فتنہ سے ہر طرح مطمئن ہو چکے تو ان کو حکم ہوا کہ قوم عمالقہ سے جا کر جہاد کرو یہ اُس طرف چلے مگر جب قریب پہنچے تو ہمت ہار دی اور جہاد سے انکار کر بیٹھے - اللہ تعالےٰ اِنپر ناراضی ہوئی اور اِن کو چالیس برس تک ویسے ہی ریگستان میں پھرایا جب

دھوپ کی شدت سے ان کا بُرا حال ہوا اور کہیں درخت وغیرہ کے سایے میں امن نہ ملی تو انھوں نے دعا کی۔ خداوند مجیب الدعوات نے اُنکی دعا کو قبول فرمایا اور اُنکے سایہ کیواسطے بادل کر دیا۔ جسکو سید خاں ایک معمولی بات سمجھ کر اس انداز سے بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت ابر آجاتا ہوگا۔ حالانکہ سیدھی بات یہ ہے کہ جب ہر وقت بنی اسرائیل کا گذر ایسے ریگستان میں رہتا تھا تو کسی وقت ابر آجانے سے اُنکی کیا تکلیف رفع ہو سکتی تھی اُنکو تو ایک لمحہ بھی بغیر ابر کے راستہ چلنا دشوار ہو جاتا پس جب اُنکا برسوں اُس جنگل میں رہنا اور سفر کرنا مسلم ہے تو بادل کا ہر وقت سایہ کرنا بھی لامحالہ تسلیم کرنا پڑیگا اور جب یہ تسلیم ہو گیا تو معجزہ سے انکار کرنا سراسر ہٹ دھرمی ہوگی من وسلویٰ اُس ریگستان میں ایک تو بادل ہر وقت اُنکے ساتھ رہتا تھا دوسرے من وسلویٰ کھانے کے لیے اُترتا تھا۔ من ترنجبین کی طرح کی ایک خوردنی شے تھی جو آسمان سے مثل برف کے برس کر درختوں کے پتوں پر جم جاتی تھی اور سلویٰ ایک جانور بٹیر کی برابر رات کو خیموں کے پاس جمع ہو جاتے تھے جن کو بنی اسرائیل اندھیرے میں پکڑ کر کام میں لاتے تھے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۝

اور یاد کرو وہ زمانہ کہ جب موسیٰ نے اپنی قوم کیواسطے پانی مانگا پس حکم کیا ہمنے کہ اپنے عصا کو پتھر پر مار پس پھوٹ نکلے اُس سے بارہ چشمے

م۔ اُس ریگستان کی دو نعمتوں کا ذکر ایک بادل کا دھوپ سے سایہ کرنا۔ دوسرے کھانے کے واسطے من وسلویٰ اُتارنا پہلے ہو چکا ہے اب ایک تیسری نعمت کو یاد دلاتے ہیں کہ جس وقت موسیٰ کی قوم نے اُن سے پانی طلب کیا تو ہمنے کہا کہ اپنا عصا پتھر میں مار (موسیٰ نے پتھر میں عصا مارا) پس اُس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ اب دیکھیے اول بادل کا سایہ کرنا۔ دوسرے من وسلویٰ کھانے کے لیے اُترنا۔ یہ بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ اب عصا کے مارنے سے پتھر سے بارہ چشمے بہ نکلنا اسمیں بے انتہا دُنیا و دین کی نعمتیں شامل ہیں۔ دُنیا کی نعمت تو ظاہر ہے

کر اُنکی بسخت حاجت پانی کی پوری کی - اگر اس میدان میں پانی نہ ملتا تو یقیناً وہ ہلاک ہو جاتے - تو

ایسے وقت میں ایک پتھر کا ضرب عصا سے پھٹنا اور اُس سے پانی بہ نکلنا صاف دلالت کرتا ہی

کہ اس نعمت کے برابر کوئی نعمت نہیں ہو سکتی اور دین کی نعمت یہ ہی کہ ایسے وقوعہ کا پیش آنا

اور ایسی مایوسی کی حالت میں پانی کا ملنا خدا کی قدرت و عظمت پر یقین کو کمال درجہ پر پہونچاتا ہی

جو نجات اخروی کے لیئے اعلیٰ ترین اسباب ہی -

اور بارہ چشمے کر دینے میں یہ حکمت تھی کہ بنی اسرائیل کے بھی بارہ حصے تھے - اگر

ایک جگہ پانی ہوتا تو اژدحام کیوجہ سے بڑی دشواری پیش آتی - اس واسطے بارہ چشمے

پتھر کے ہر ایک جانب سے تین تین چشمے نکالے گئے کہ ہر ایک قافلہ آسانی سے پانی لے سکے

جیسے کہ دریا میں بارہ راستے کر دیئے تھے اور اسکو معجزہ سمجھنے کے لیئے پانچ دلیلیں ہیں ایک

تو خشک پتھر سے پانی نکلنا دوسرے ضرب عصا سے نکلنا - تیسرے چھوٹے سے پتھر سے

ایسے بڑے قافلے کے لیئے نکلنا - چوتھے بقدر ضرورت نکلنا - پانچویں ضرورت نہ ہونے کے

وقت پانی بند ہو جانا - فنقول ہذہ الوجوہ الخمستہ لایمکن تحصیلہا الا بقدرۃ عامۃ وحکمۃ تامۃ

وما ذلک الا للحق سبحانہ وتعالے - اب سُنیئے محقق زماں مفسر دوراں - فدائے قوم اور

فنا فی القوم اس معجزے کی حقیقت کیا مختصر الفاظ میں بیان فرما کر قصہ تمام کرتے ہیں - جس

مقام پر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے پانی مانگا تھا اُس مقام کے پاس پہاڑیاں ہیں -

جنکی نسبت خدا نے حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کے سہارے سے اس پہاڑی پر چلی - اس پہاڑی کے

پرے ایک مقام ہی (ایلم) وہاں بارہ چشمے پانی کے جاری ہیں -

م - قربان جایئے اس اختصار کلامی کے - ناظرین آپنے دیکھ لیا کہ صاف اور

بیّن معجزے کو سید احمد خاں نے کیسا غت ربود کیا ہی - یہاں بھی آپنے وہی اُمس کی ترکیب

لڑائی ہی جس سے یہ معنی نکالے ہیں کہ وہ چشمے پہلے ہی سے جاری تھے اور ضرب کے معنی چلنے کے

لیکر تقدیر کلام کی - جیسے وہاں اِضْرِبْ بِعَصَاكَ فِی الْبَحْرِ نکالی تھی معلوم ہوتا ہی ایسے ہی یہاں

بھی اضرب بعصاک فی الحجر نکالی ہی، سو آپ کو بخوبی معلوم ہو گیا کہ ہم نے وہاں ان دونوں ترکیبوں کو کیساب ترکیب کر دیا ہی اب یہاں ایک غلطی ان کی صریح یہ ہی کہ حجر کے معنی پہاڑی کے لیے ہیں۔ حالانکہ پہاڑ یا پہاڑی کے واسطے جبل ہی اور حجر کے معنی ایک تنہا پتھر کے ہیں علاوہ اسکے یہ ایک بدیہی امر ہی کہ بنی اسرائیل کی جمعیت چھ لاکھ تھی تو خیال کر لیجیے کہ اُن کے لیے کس قدر میدان کی ضرورت ہوگی اور وہ کتنی دور تک پھیل رہے ہونگے۔ سو اگر بارہ چشمے وہاں پہلے سے جاری ہوتے تو لازمی تھا کہ اُن کا کوئی حصہ بنی اسرائیل کے درمیان ہوتا اور ذرا بھی تلاش کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیونکہ اتنا بڑا لشکر ایک پہاڑی کیا کتنی ہی پہاڑیوں کو گھیرے ہوئے ہوتا یہ عجیب بات ہی کہ موسیٰ ع کے تھوڑی دور لاٹھی کے سہارے چلنے سے بارہ چشمے مل گئے۔ اور اتنے آدمیوں میں سے پہلے سے کسی نے نہ دیکھا۔

اور بات یہ ہی کہ اگر سید احمد خاں معجزہ کے قائل ہوتے تو وہ اس صورت میں بھی معجزہ ثابت کر سکتے تھے اور وہ اِس طرح کہ بیشک وہ چشمے پہلے سے جاری تھے اور قوم بنی اسرائیل اُنکو احاطہ کیے ہوئے بھی تھی لیکن اُنکو نظر نہ آتے تھے پس اللہ تعالےٰ کو یہ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دکھانا منظور تھا کہ اُن کا لاٹھی کے سہارے تھوڑی دیر چلنا تھا کہ سب کو وہ چشمے دکھلائی دے گئے اور پانی لینے میں مشغول ہو گئے مگر پھر یہ ہی کہ اگر وہ نفس معجزہ کے قائل ہوتے تو اسقدر ہیر پھیر کرنے کی کیا ضرورت ہوتی۔ اور ہر جگہ ضرب کے معنی چلنے کے کیوں لیتے۔ ایک اور عجیب بات ہی سید احمد خاں علماء مفسرین کو تو یہودیوں کا پیرو بتلاتے ہیں مگر جہاں اپنا اُلو سیدھا کرنا ہوتا ہی وہاں خود توریت پر رجوع کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ مضمون آپنے توریت کی کتاب خروج باب ۵ اور ۱۸ سے اخذ کیا ہی۔ (بعد ازاں به ایلم آمدند ودر آنجا دوازده چشمهٔ آب یافتند و هفتاد درخت خرما ودر آنجا به پهلوئے آب اردو زدند) اور یہ حال تو آپکا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پتھر سے پانی نکالنے میں ہی اور جب ہم حضور سرور کائنات علیہ افضل التحیات کا یہ معجزہ کہ، ایک غزوہ میں جب پانی کی تنگی ہوئی تو حضور نے اپنا دست مبارک

اپنے وضو کے برتن پر رکھدیا تو آپکی انگلیوں سے اتنا پانی بہ نکلا کہ سب لشکر کو کافی ہو گیا" سامنے کر ینگے تو نہ معلوم کس حیلہ سے جان بچا دینگے - مگر سید صاحب کے پاس سوائے اس حیلہ کے کہ اسکی صحت یا شمشیہ ہی یقین کے قابل نہیں ہی اور کیا رکھا ہی -

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ

اور جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا اور کوہ طور تمھارے اوپر اٹھایا

م - جب موسیٰ علیہ السّلام کو کوہ طور پر توریت عطا ہوئی تو آپنے اپنی قوم پر پیش کرکے فرمایا کہ اسکو قبول کرو اور اسکے احکام پر عمل کرو اُنھوں نے اس سے انکار کیا اور بہت سی حجتیں کرنے لگے ایک حجت یہ کی کہ اگر خدا ہم سے خود کہدے کہ یہ میری کتاب ہے تو ہم مانیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم سے اسپر بھی آمادگی ظاہر فرمائی - بنی اسرائیل نے اپنے میں سے ستر آدمی منتخب کرکے حضرت موسیٰ کے ساتھ کیئے وہاں پہنچ کر ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام خود سُنا جب یہ حجت تمام ہو چکی تو اب یہ شق لڑائی کہ جب مانیں کہ ہم اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اب آواز تو آئی لیکن معلوم نہیں کون بول رہا ہی - چونکہ کوئی شخص دیدار باری تعالےٰ کی دُنیا میں طاقت نہیں رکھتا اس لیئے اُن کی اس شرارت پر بجلی گری اور وہ سب کے سب مر گئے - پھر حضرت موسیٰ نے دعا کی کہ یہ زندہ ہو جائیں - ایسا نہ ہو کہ بنی اسرائیل مجھے متہم کریں کہ نہ معلوم کس حیلہ سے مار ڈالا ہو گا اللہ تعالےٰ نے انکو زندہ کر دیا - جب وہاں سے واپس آئے تو اگرچہ شہادت تو دی مگر پھر بھی کچھ ملاوٹ کی باتیں کر دیں اور مقصود یہی تھا کہ عمل نہ کیا جاوے اللہ تعالےٰ نے فرشتہ کو حکم دیا کہ کوہ طور ان کے سروں پر معلق کر دے - چنانچہ دوسری جگہ بھی اسکو واضح طور پر بیان فرمایا ہی - وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ - پس جب پہاڑ اُنکے سروں پر آ تنا اور اُن کو یقین ہو گیا کہ اب اس سے مفر نہیں ہو سکتا مجبوراً توریت کو قبول کیا - سید صاحب کو پہاڑ کا مثل سائبان کے اوپر ہو جانا

خلاف قانون قدرت معلوم ہوتا ہی اسلیے جیسے عبور بحر - وشق حجر - وغیرہ میں آپنے انگھڑت تاویلیں
کی ہیں ایسے ہی یہاں بھی بہت کچھ اناپ شناپ ہانکی ہی - اول آپ آیت کے لفظی معنی کی
تحقیق کرتے ہیں - رفع کے معنی اونچا کرنے کے ہیں مگر اس لفظ سے یہ بات کہ جو چیز اونچی کی
گئی ہی وہ زمین سے بھی معلق ہو گئی ہو لازم نہیں آتا - دیوار اونچا کرنے کو بھی رافعنا کہہ
سکتے ہیں حالانکہ وہ زمین سے معلق نہیں ہوتی - فوق کے لفظ میں بھی اُسکا زمین سے معلق
ہونا لازم نہیں ہی سورۂ اعراف کی آیت واذ نتقنا الجبل الخ میں نتق کا لفظ البتہ بحث طلب
ہے جسکے معنی مفسرین نے مذہبی عجائبات بنانے کو قلع کے لیے ہیں مگر قاموس میں اسکے
معنی زعزعہ کے لکھے ہیں اور زعزعہ درخت کے ہلا دیے کو کہتے ہیں - یعنی ہم نے پہاڑ کو
ہلا دیا - اور الفاظ ظنوا انہ واقع بہم زیادہ تر پہاڑ کے ہلا دینے کے جس سے اُنکو اُسکے
گر پڑنے کا گمان ہوا مناسب ہیں کانہ ظلۃ - میں ظلہ کے معنی سائبان کے ہو سکتے
ہیں چھتری کے بھی ہو سکتے ہیں اور جو چیز کہ ہم پر سایہ ڈالے اُسکے بھی ہو سکتے ہیں اور
اُس چیز کا معلق ہمارے سر پر ہونا ضرور نہیں - پس ظلہ کے لفظ سے یہ بات لازم نہیں
آتی کہ وہ معلق سر کے اوپر ہو - غرضکہ آپنے ہر لفظ سے یہ ثابت کر دیا کہ پہاڑ اُن کے
سر پر معلق نہیں ہوا تھا اب آپ کا اصلی عندیہ سُنیے لکھتے ہیں اب غور کرنا چاہیے کہ
واقعہ کیا ہی - بنی اسرائیل جو خدا کو دیکھنے گئے تھے طور کے نیچے کھڑے ہوئے تھے - پہاڑ
اُنکے سر پر نہایت اونچا اُٹھا ہوا تھا وہ اُسکے سایہ کے تلے تھے اور طور بسبب آتش
فشانی کے شدید حرکت اور زلزلہ میں تھا جسکے سبب وہ گمان کرتے تھے کہ اُنکے
اوپر گر پڑیگا - پس یہ کوئی ایسی بات نہیں ہی جو عجیب ہو - ہاں مفسرین نے اپنی تفسیروں
میں اس واقعہ کو عجیب و غریب واقعہ بنا لیا ہی - اور ہمارے مسلمان مفسر عجائبات
دوراز کار کا ہونا مذہب کا فخر اور اُسکی عمدگی سمجھتے تھے اس لیے اُنھوں نے تفسیروں میں
لغو اور بیہودہ عجائبات بھر دی ہیں -

م - سید صاحب نے اس زبردست معجزہ کو بالکل معمولی بات سمجھ کر ایسے معنی بیان کیے
ہیں کہ جس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہی کہ خدا کے پہاڑ کے نیچے کھڑا ہونا یاد دلایا ہی اور وہ اس
طرح کہ جب تم پہاڑ کے نیچے کھڑے تھے اور پہاڑ بسبب آتش فشانی کے زلزلہ میں تھا - جسکو تم یہ
سمجھتے تھے کہ اب ہمپر گر پڑیگا وہ پہاڑ تم سے بلند تھا اور اُسکا سایہ تم پر پڑ رہا تھا - ناظرین اصل
یہی ہی کہ سید صاحب نے قرآن کو خدا کا کلام سمجھ کر تفسیر نہیں لکھی بلکہ اُسکو محض ایک مجنون و دیوانے
کی بڑ سمجھے ہیں - اسواسطے ایک ایسے واقعے پر جسکو خدا نے وہ انداز سے بیان فرمایا ہی وَرَفَعۡنَا
فَوۡقَكُمُ الطُّورَ - نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ اُنھوں نے ذرا بھی خیال نہیں کیا - بلکہ
اسکے ایسے معنی بنائے ہیں جس سے دونوں میں سے ایک کا فضول ہونا لازم آتا ہی اور اُنکے خیال
کے موافق مجنون و دیوانے کی بڑ میں فضول باتیں ہونا بھی کوئی عجیب بات نہیں ہی - اکثر ہوا ہی
کرتی ہیں - اس سے پہلے واقعات کا تو آپکی تقریر سے کچھ وجود بھی معلوم ہوتا تھا لیکن یہاں تو
لغت کی تحقیق کے بھروسہ پر سرے سے سارے قصے ہی کو لغو اور بیہودہ بنا دیا حالانکہ جو معنی
آیت کے اس تحقیق سے خود تراشے ہیں وہ اس درجہ بیہودہ اور لغو ہیں کہ اُنکو سُنکر معمولی سمجھ
بوجھ کا آدمی بھی آپکو مہمل اور کندۂ ناتراش کہے بغیر نہیں رہ سکتا - ناظرین خیال تو کیجیے کہ یہ
بات کیا ہوئی کہ تم پہاڑ کے نیچے کھڑے تھے اور وہ تم سے اونچا تھا جس کا سایہ تمپر پڑ رہا تھا - اس
یاد دلانے سے مخاطبین کو کیا عبرت ہوئی ہوگی اور کیا خدائی رعب اُنکے دلوں پر بیٹھا ہوگا
لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم - بنی اسرائیل کے اسی وقت کوہ طور کے نیچے جانے پر
کیا منحصر ہی وہ جب جاتے پہاڑ اُنسے اونچا ہی ہوتا اور اُن پر اُسکا سایہ بھی پڑتا - اور اس حساب
سے کوہ طور ہی کی کیا خصوصیت ہے جس پہاڑ کے نیچے اُن کا گذر ہوتا ہوگا وہی اُنسے اونچا اور
اُن پر سایہ ڈالتا ہوگا - پہاڑ کی بھی ضرورت نہیں اونچی دیواریں اور درخت بھی انپر سایہ
ڈالتی ہونگی بنی اسرائیل کو بھی جانے دیجیے - سید کے حواری ہی میں سے کوئی اونچی دیوار کے
نیچے کھڑا ہو کر دیکھے کہ وہ اُنسے اونچا بھی معلوم ہوگا اور سایہ بھی ڈالیگا - پھر وہ بات کیا ہی

جو خداوند جل وعلی شانہ نے کئی جگہ مختلف الفاظ میں یاد دلائی ہی معلوم ہوتا ہی کہ سید صاحب خوش قسمتی سے کبھی پہاڑ کے نیچے کو نہیں نکلے۔ اگر ایک دفعہ بھی نکل جاتے تو اُن کو اپنی عالی دماغی کا خوب اندازہ ہو جاتا۔ پس ناظرین آپ یاد رکھیں کہ نفس کے بندوں اور خیالی ڈھکوسلوں پر ناز کرنے والوں کو کبھی اصل راز کا پتہ نہیں چلا کرتا یہ اُن لوگوں کا حصہ ہی کہ جو احادیث نبوی اور صحابہ رضی مفسرین کی روایتوں کی دل وجان سے تصدیق کرتے ہیں۔ اب سنیئے سید صاحب نے۔ رفع۔ فوق۔ نتق۔ ظلہ کی تحقیق خوب دل کھولکر اور خوش ہو ہو کر کی۔ اور سمجھ گئے کہ یہ حقیقی معنی جدید علم کلام کے ذریعہ سے میں نے ہی دریافت کیے ہیں۔ مگر افسوس صد افسوس۔ تمام لفظوں کو ایک ایک کرکے چھان مارا مگر کَاَنَّہٗ ظُلَّۃٌ میں کَاَنَّ حرف تشبیہ پر ذرا غور نہ کیا جو تمام مطلب کو صاف کر دیتا ظُلَّہ کے معنی آپنے تین بیان کیے ہیں۔ چھتری۔ سائبان۔ اور جو چیز ہمپر سایہ ڈالے عام اس سے کہ وہ معلق ہو یا مثل دیوار کے ہو اور سب سے زیادہ زور آپ نے تیسرے معنی پر دیکر دیوار کے معنوں میں خاص کر دیا ہی لیکن اگر کَاَنَّ پر غور کیا جاوے تو سوائے پہلے دو معنوں کے تیسرے معنی اس آیت میں ظلہ کے ہو ہی نہیں سکتے ہمیں شک نہیں کہ ظلہ کے تیسرے معنی بھی مستعمل ہوتے ہیں لیکن بات یہ ہی کہ اس پہاڑ کی یہ صورت مثل دیوار کے سایہ ڈالنا تو ہر وقت اُن کے جانے سے پہلے بھی ہوتی تھی اور چلے آنے کے بعد بھی لیکن حرف کَاَنَّ لاکر جو ظلہ کو مشبہ بہ قرار دیا ہی اس سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ ظلہ کے اس جگہ وہ معنی مراد ہیں جو پہاڑ (یا دیوار) کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہے۔ اور وہ چھتری یا سائبان میں سے کوئی ایک سا ہی۔ کیونکہ مشبہ اور مشبہ بہ میں فرق ہونا لازمی ہی۔ ورنہ حرف کَاَنَّ بیکار ہوتا ہی پس بلا کسی تکلف اور تاویل کے اس آیت کے حقیقی معنی یہی ہیں کہ وہ پہاڑ ہم نے اُن کے اوپر مثل سائبان کے کر دیا تھا جسکو وہ سمجھے کہ اب ہمپر گر کر چکنا چور کر دیگا۔ اور جب ظلہ کے معنی سائبان کے معین ہو چکے تو رفع۔ فوق۔ نتق کے لا بدی وہی معنی لیے جاویںگے جو حضرات مفسرین نے بیان فرمائے ہیں۔ اور بلا چون وچرا کے یہ ماننا پڑیگا کہ کوہ طور اپنی اصلی جگہ سے اُکھڑ کر مثل

سائبان کے بنی اسرائیل کے سروں کے اوپر معلق ہو گیا تھا سید صاحب کو صرف اپنی ہٹ پوری کرنے اور مفسرین رحمہم اللہ کو دو چار سنانے کی غرض سے بڑے بڑے پیچ کھانے پڑتے ہیں ورنہ جیسے ضرب عصا سے دریا کے پھٹ جانے میں یہ آیۃ وَاَوْحَیْنَا اِلیٰ مُوْسیٰ اَنِ اضْرِبْ بِعَصَاکَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ صاف ہے ایسے ہی رفع طور میں یہ آیۃ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ کَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ الخ بالکل واضح اور روشن ہے۔

غضب تو یہ ہے کہ آپنے اسپر کوئی تاریخی حوالہ بھی نہیں دیا کہ سمندر جوار بہاٹے سے خشک ہوا تھا۔ اور کوہ طور آتش فشانی سے ہل رہا تھا افسوس ہے سید صاحب یہ لکھتے وقت آپکا دماغ بیکار نہ ہوا ہاتھ میں رعشہ نہ آیا۔ قلم نہ ٹوٹا۔ دوات کی سیاہی خشک نہ ہوئی۔ کہ آپ ہزار سر مارتے اور ایک حرف نہ لکھ سکتے۔ ناظرین! ہم اس واقعہ پر اپنے تاسف دلی اور مافی الضمیر کا کیا اظہار کریں آپکے دل میں اگر کچھ خدا اور خدا کے کلام کی وقعت ہے تو خود ہی جو جاہیں فتویٰ لگا لیں وانا نعوذ باللہ من شرور سید احمد خان

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْکُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ کُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِیْنَ ۝

اور جان چکے ہو تم ان لوگوں کو جنھوں نے تم میں سے تجاوز کیا ہفتہ کے دن پس کہا ہم نے اُنکو کہ ہو جاؤ تم بندر ذلیل

س۔ یہودیوں کی شریعت میں سبت کا دن عبادت کا تھا اور اسمیں کوئی کام کرنا یا کھیلنا منع تھا مگر ایک گروہ یہودیوں کا جو دریا کے کنارے پر رہتا تھا فریب اور حیلے سے سبت کے دن بھی شکار کھیلا کرتا تھا۔ اُن کی قوم کے مشائخ نے منع کیا جب نہ مانا اُن کو قوم سے منقطع برادری سے خارج کھانے پینے سے الگ میل جول سے علٰحدہ کر دیا اور اسی لیے اُن کی حالت بندروں کی سی ہو گئی تھی جسکی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ کونوا قردۃ خاسئین یعنی جس طرح بندر انسانوں میں ذلیل و خوار ہیں اسی طرح تم بھی انسانوں سے علٰحدہ ذلیل و خوار و رسوا ہو۔ علما مفسرین نے اسکی تفسیر میں بھی عجیب و غریب باتیں بیان کی ہیں اور

لکھا کہ وہ لوگ سچ مچ صورت و شکل و خاصیت میں بھی بندر ہو گئے تھے اور تیسرے دن مر گئے مگر یہ باتیں لغو و خرافات ہیں۔

م۔ ناظرین! آپنے دیکھا کہ مفسرین کی تفسیر تو لغو و خرافات ٹھہرائی۔ اور خود یہ معنے بیان کیے کہ وہ چونکہ برادری سے الگ کر دیئے گئے تھے اس لیے اُنکی حالت بندروں کی سی ہو گئی تھی ورنہ درحقیقت اُنکی صورتیں مسخ نہیں ہوئی تھیں۔ خیر اب ہم انکی اس جہالت اور نادانی کا کہاں تک رونا روویں آپکو اصل تفسیر مختصر طور پر سُناتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ایک قوم دریا کے کنارے مدینہ اور شام کے درمیان رہا کرتی تھی اور اُس مقام پر دریا کی تمام مچھلیاں مہینے میں ہفتہ کے دن جمع ہوتی تھیں۔ یہ وہ قریہ ہی کہ جسکا ذکر قرآن مجید میں ہی وَاسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ۔ اس قریہ والوں نے یہ ترکیب چلی کہ دریا کے کنارے حوض کھودے اور اسمیں جدول نکالیں مچھلیاں اُسمیں داخل ہو جاتی تھیں اور وہ شکار کر لیا کرتے تھے۔ اُنکی اسی حرکت کو اعتدار فرمایا ہی آخر یہ ہوا کہ ایک جماعت اہل مدینہ کی کہ جو اس دن شکار کھیلنا بُرا سمجھتی تھی انکے پاس پہنچی اور اُنکو اس دن شکار کھیلنے سے منع کیا وہ نہ مانے اور کہنے لگے کہ ہم اس عمل کو ایک زمانے سے کرتے ہیں اور اسمیں خدا نے ہمیں بڑا نفع دیا ہی اس جماعت نے کہا کہ تم حد سے نگذرو ایسا نہ ہو کہ تم پر عذاب نازل ہو اور تم ہلاک ہو جاؤ۔ یہ تو اُن کو سمجھا کر الگ ہوئے اگلے روز جو صبح ہوئی تو وہ کل قوم شکاری بندر ہو گئی۔ اور اس حالت پر وہ تین دن ٹھہرے پھر ہلاک ہو گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا کہ یہ بندر اُنہیں کی نسل سے ہیں کہ جو مسخ کیے گئے تھے آپنے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کسی قوم پر عذاب نازل فرما کر اسکی نسل نہیں چلاتا۔ بعض کا خیال یہ بھی ہوا ہی کہ یہ موجودہ بندر اُنہی کی نسل ہیں مگر یہ ٹھیک نہیں ہی۔

وَاِذْ قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تم کو یہ حکم کرتا ہی کہ ایک بیل ذبح کرو تو انہوں نے کہا کہ کیا تم ہمسے ٹھٹھا کرتے ہو

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ۝

کہا پناہ اللہ کی کہ میں جہالت کرنے والوں سے ہوں

س۔ یہ قصہ توریت میں بھی ہی مگر اسمیں بنی اسرائیل کا موسیٰ سے اتہ پتہ پوچھنا مذکور نہیں ہی اور اُسکے ذبح کے بعد جو قصہ توریت میں ہی وہ قرآن مجید میں نہیں ہی بہرحال اتنی بات کہ بیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا قرآن اور توریت دونوں میں موجود ہی وہ بیل بُت پرستوں یا کافروں کے طریقے پر بطور سانڈ کے چھوڑا ہوا تھا۔ بنی اسرائیل چاہتے تھے کہ وہ ذبح ہوجانے سے بچ جاوے اِسی لیئے اُسکے اَتے پتے پوچھتے تھے پس اِس قصہ میں کوئی اعجوبہ بات نہیں ہی مفسرین نے بلاشبہ غلطی کی ہی جو یہ سمجھا ہی کہ یہ قصہ اگلی آیت واذ قتلتم نفسا سے متعلق ہی حالانکہ اس قصے کو پہلے قصے سے کچھ تعلق نہیں ہی بیل کے ذبح کرنے کا قصہ اور ہی اور یہ دوسرا قصہ ہی کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص مارا گیا تھا اور قاتل معلوم نہ تھا اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ سب لوگ موجود ہیں اور اُنہیں میں قاتل بھی ہی مقتول کے اعضا سے مقتول کو ماردیں جو لوگ درحقیقت قاتل نہیں ہیں وہ بسبب یقین اپنی بیجرمی کے ایسا کرنے میں کچھ خوف نہ کرینگے۔ مگر اصلی قاتل بسبب خوف اپنے جرم کے جو از روے فطرت انسان کے دلمیں ہوتا ہی ایسا نہیں کرنے کا اور اسی وقت معلوم ہوجاویگا۔ اُس زمانے میں اس قسم کے حیلوں سے بہت سے چور معلوم ہوجاتے تھے اور وہ بسبب خوف جرم کے ایسا کام جو دوسرے لوگ بلاخوف بسبب بیجرمی کے کرتے تھے نہیں کرسکتے تھے بس یہ ایک تدبیر قاتل کے معلوم کرنے کی تھی اِس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔

م۔ اسکا قصہ اس طرح ہوا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص قتل ہوگیا تھا۔ اور وہ

قتل ہونے کی یہ ہوئی کہ کسی شخص نے اِس مقتول کی بیٹی سے نکاح کرنیکی درخواست کی تھی۔
اُسنے انکار کیا پس انکار کرنے پر اُسنے اُسکو قتل کر دیا اسکی خبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس
پہنچی آپنے قاتل کی تلاش میں بڑی کوشش کی جب کچھ پتہ نہ چلا تو بنی اسرائیل نے حضرت
موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ اپنے ربسے قاتل کو پوچھیے پس موسیٰ علیہ السلام نے بحکم خدا
ایک بیل کے ذبح کرنے کا حکم فرمایا اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً ۝ انہوں نے یہ سُنکر
تعجب کیا اور کہا اَتَتَّخِذُنَا ہُزُوًا۔ کیا آپ ہم سے مخول کرتے ہیں۔ قاتل کی تلاش کو بیل کے
ذبح کرنے سے کیا نسبت پھر انہوں نے اُس بیل کا وصف دریافت کیا پس جب اللہ تعالےٰ
نے اُسکا وصف بیان کر دیا کہ وہ زرد رنگ کا ہی کہ جو دیکھنے والے کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ پھر انھوں
نے پوچھا کہ ایسا بیل ہم پر مشتبہ ہوتا ہی اسکا پورا پتہ معلوم ہونا چاہیے۔ موسیٰ علیہ السلام
نے فرمایا کہ میرا رب یہ کہتا ہی کہ وہ سدھا ہوا نہیں ہی نہ زمین جوتتا ہی نہ کنوئیں میں چلتا ہی
صحیح سالم یکرنگا ہی جسمیں کہیں دھبہ نہیں ہی جب یہ تمام صفتیں معین ہو گئیں تو ایسا بیل ایک
شخص کے پاس ملا جسکو اُسنے کئی گُنی قیمت پر فروخت کیا۔ بنی اسرائیل نے خرید کر ذبح کر ڈالا
پھر موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ اسکا ایک عضو لو اور مقتول سے مارو۔ اُن کا ایسا کرنا تھا کہ مقتول
زندہ ہو گیا اور اُسنے اپنے قاتل کا نام بتا دیا اور پھر وہیں گر پڑا۔ سید صاحب آگے چلکر یہ بھی
لکھتے ہیں کہ جو مطلب ہم نے بیان کیا ہی یہ سیدھا سادہ ہی اور اسمیں کوئی جملہ خلاف از عقل اور بغیر
سند نقل کے اپنی طرف سے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کا اپنے منہ میاں مٹھو بننا بھی
عجیب لطف رکھتا ہی۔ ہمنے آپکی تفسیر میں جس عبارت پر خط کھینچا ہی۔ ناظرین آپ ملاحظہ فرمائیں
اور اگر کوئی ہو تو اُس سے دریافت کریں کہ یہ اتنی عبارت کہاں سے نکلی ہی اور اسکی سند
کیا ہی۔ کسی مورخ کا قول بھی نہیں لکھا۔ غالبًا یا تو توریت سے لیا ہی یا من گھڑت ہی۔ کیونکہ
آپکی عادت ہی کہ جب آپکی نام کی عقل میں کوئی بات نہیں آتی تو یا تو توریت سے اخذ کیا کرتے
ہیں یا ٹیڑھا ترچھا جو کچھ سوجھتا ہی وہی لکھ مارتے ہیں آپنے اس سارے ایک قصے کو دو جگہ

ہیں مگر معلوم نہیں کہ صرف بیل کے ذبح کرنے کا نفع اور اُسکا نتیجہ کیا قرار دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے اس فرمانے میں کہ تم بیل کو ذبح کرو کیا حکمت سمجھی۔ علاوہ اسکے مقتول کے اعضاء کو آپس میں
لڑانے اور اُسکو حیلہ چور کے دریافت کرنے کے بتلاتے ہیں جو کچھ آپکا اسلام اور ایمان معلوم ہوتا
ہے وہ ناظرین پر بھی ظاہر ہوگیا ہوگا ہمیں اسمیں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہاں اتنا ضرور لکھتے
ہیں کہ اگر فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا کا یہ مطلب ہوتا تو دونوں جگہ ضمیر یکساں آتی نہ کہ اُسی جملہ میں
ایک شے کے لیے ایک ضمیر مذکر اور ایک مؤنث کی۔ فافہم

وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ

اور دیے ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزے اور قوت دی ہم نے اُسکو روح پاک یعنی جبرئیل سے

م ۔ اِس آیت میں بینٰت سے مراد معجزے ہیں۔ سو اول یہ جاننا چاہیئے کہ معجزہ
کسکو کہتے ہیں۔ جو چیز کہ خلاف عادت اور خلاف قانون قدرت یعنی بغیر اس بات کے کہ وہ
اپنے اسباب پر مبنی ہو کسی شخص سے سرزد ہو تو اُسکو خارقِ عادت کہتے ہیں مثلاً عادت
یوں جاری ہے اور قانون فطرت اس طرح پر ہے کہ بھوک پیاس کھانے پینے سے دور ہوتی
ہے یا درخت اور پتھر اور حیوانات گائے بھینس وغیرہ انسان سے کلام نہیں کرتے۔ کوئی
درخت یا پتھر کسی کے بُلانے سے بحرکت ارادی نہیں آسکتا۔ یا کوئی شخص دریا پر زمین
خشک کی طرح نہیں چل سکتا۔ یا ایک آدمی کا کھانا کئی آدمیوں کا شکم سیر نہیں کرسکتا نہ
سیر آدھ سیر پانی کے ہاتھ لگانے سے لشکر سیراب ہوسکتا ہے۔ نہ کوئی شخص ایک مشت خاک
سے صدہا آدمیوں کو اندھا کرسکتا ہے پس جو ایسا کرے اُسکا کام خارق ہے۔ اب یہاں سے
یہ بات سمجھ میں آگئی کہ جو کام بذریعہ آلات و اسباب و خاصیت بعض مرکبات ہو وہ خارق
عادت نہیں۔ پھر اگر خارق عادت مدعی نبوت سے ظاہر ہو تو اُسکو معجزہ کہتے ہیں
کہ مخالف کو اُسکے مثل کام کرنے سے عاجز کردیتا ہے۔ اب خواہ مدعی نبوت سے یہ معجزہ ایک

معمولی طور پر صادر ہوا اُسوقت نبوت کا دعویٰ بھی ہو طریقہ ہدایت کا از طرف خدائی عزوجل ہمیشہ ایسا ہی جاری رہا کہ ہر پیغمبر اور نبی اللہ کے زمانے میں جس علم اور عمل کی وجہ سے امت کو ضلالت ہوتی تھی وہی معجزہ اُس نبی کو خاصکر عطا ہوا۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو ابطال سحر کا معجزہ۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شفائے امراض لاعلاج کا معجزہ۔ اور ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ۔ علاوہ دیگر معجزات کے عطا ہوا۔

سید صاحب لکھتے ہیں معجزہ۔ نبوت کے ثبوت کی کیونکہ دلیل ہو سکتا ہی۔ اثبات نبوت کے لیے اول خدا کا وجود اور اُسکا متکلم ہونا اور اسمیں اپنے ارادے سے کام کرنے کی قدرت کا ہونا اور اُسکا تمام بندوں کا مالک ہونا ثابت کرنا چاہیے پھر اسکا ثبوت چاہیے کہ وہ اپنی طرف سے رسول و پیغمبر بھیجا کرتا ہی۔ پھر جو شخص دعویٰ نبوت کرتا ہی وہ درحقیقت اُسکا بھیجا ہوا ہی ہم پہلی دو باتوں سے قطع نظر کرتے ہیں کیونکہ کہا جا سکتا ہی کہ قرآن مجید میں ایسے مقامات پر اکثر اہل کتاب مخاطب ہیں جو اُن دونوں پہلی باتوں کو مانتے تھے اور اسلیے معجزات سے صرف تیسری بات کا ثابت کرنا مقصود ہی۔ غرضکہ سید صاحب وقوع معجزے کے منکر ہیں اور اُنکا جابجا یہی دعویٰ ہی کہ کوئی امر خلاف قانون قدرت واقع نہیں ہو سکتا۔ کتاب الکشف عن مناہج الادلۃ فی عقائد الملۃ مولفہ ابن رشد مین بعث انبیاء پر جو مباحثہ مذکور ہی سید صاحب نے ابن رشد کی تقریر کو منتخب کرکے یہ سات شبہے نقل [1] کیے ہیں۔ (۱) جو کہ امر واقع ہو اسکی نسبت اِس امر کا ثبوت نہیں ہوتا کہ جس سے وہ واقع ہو وہ رسول ہوتا ہی۔ (۲) کوئی خرق عادت ایسی معلوم نہیں جو بطور خاصہ رسولوں سے مخصوص ہو (۳) کچھ ثبوت نہیں کہ خرق عادت کو رسالت سے کیا تعلق ہی (۴) اسکا ثبوت نہیں ہوتا کہ اسکا وقوع قانون قدرت کے موافق نہ ہوا۔ کیونکہ بہت سے عجائبات اب بھی ایسے ظاہر ہوتے ہیں جنکا وقوع فی الحقیقت قانون قدرت کے مطابق

[1] علاوہ اسکے اور بہت سے مقامات پر آپنے ابن رشد ہی کی عبارت کو بدل کر لکھدیا ہی ورنہ خود میں اتنا مادہ کہاں سے آیا تھا خود سے تو یہی ہو سکا کہ صرفی۔ نحوی قاعدوں کو بگاڑ سگاڑ کر اُلٹو سیدھا کر لیا ہی جس سے خواجہ صاحب حالی نے آپ کو جدید علم کلام کا بانی قرار دے لیا ہی افسوس بریں عقل و دانش بباید گریست ۱۲

ہوتا ہی۔ مگر وہ قانون ابھی لامعلوم ہی۔ (۵) اسکا کچھ ثبوت نہیں ہوتا کہ جو امر واقع ہوا وہ خواص
نفس انسانی سے جو ہر ایک انسان میں ہی کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ (۶) غیر انبیاء سے جو امور خرق
عادت کے موافق ہوتے ہیں اور جو انبیاء سے واقع ہوتے ہیں اُن دونوں میں کوئی ما بہ الامتیاز نہیں
ہی۔ (۷) یہانتک کہ اہل ہنر سے جو امور واقع ہوتے ہیں اُن میں اور خرق عادت میں امتیاز
بہت مشکل ہی۔

م۔ اگرچہ ہمیں ان اعتراضات کے جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جہاں
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر ہوا ہی وہاں ہم نے بخوبی ثابت کردیا ہی کہ ان معجزات کا
ظہور واقعی ہوا۔ کلام مجید سے اسکا صریح ثبوت ملتا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث
بکثرت اس بارے میں موجود ہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑے بڑے معجزات ظاہر ہوئے
ہیں جنمیں سے ایک دو کا ذکر ضمناً ہم کر بھی چکے ہیں علاوہ اسکے یہ شبہات ابن رشد کے ہیں اگر
سید احمد خاں کچھ ذاتی ڈھکوسلہ بگھارتے یا کوئی قاعدہ نیا تراشتے تو اسوقت تو ہمیں لازمی تھا
کہ اُنکے ایک ایک لفظ کی خوب ہی پڑتال کرتے۔ تاہم جب ہم نے وہ شبہات نقل کردیے ہیں تو
مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہی کہ انکا بھی جواب دیا جاوے ایسا نہ ہو کسی کو ان شبہات سے اور
شبہات پیدا ہوجاویں اور جواب ایک کا بھی نہ ملنے سے خرابی پیدا ہوجائے۔ اچھا سنیئے پہلے
اور تیسرے کا جواب تو یہ ہی کہ رسول ہونیکی نشانیوں کی تصدیق کی کئی صورتیں ہیں۔ اُن میں سے
ایک یہ ہی مثلاً کوئی شخص علانیہ مجلس میں اہل دربار سے مخاطب ہوکر یوں کہے کہ میں اس بادشاہ
کی طرف سے ایلچی مقرر ہوا ہوں اور پھر یہ بات بادشاہ سے مخاطب ہوکر کہے کہ اگر یہ دعویٰ میرا سچ
ہی اور میں تیرا ایلچی ہوں تو اسکی تصدیق کے لئے میرے کہنے سے تو کوئی نئی بات اپنی عادت
کے خلاف ظاہر کر۔ اور بادشاہ کوئی بات اسکے کہنے سے ایسی کر گذرے جو دربار کے قانون مجوزہ
کے خلاف ہو تو اسمیں شک نہیں کہ حاضرین کو اسی وقت اُسکے ایلچی اور خاص ایلچی ہونے کا یقین
ہوجاویگا۔ یہ مثال جو ہم نے بیان کی یہ ایک تمثیل ہی تصدیق رسالت کی اسی طرح بعد ظہور معجزہ کے

رسالت کا یقین ہوجاتا ہی پس جس طرح بادشاہ کا فعل اپنی عادت اور قانون دربار کے خلاف ایلچی کی تصدیق کی نشانی ہی اسی طرح معجزہ رسالت کی نشانی ہی - اور دوسرے - پانچویں، چھٹے، ساتویں کے جواب میں یہی کافی ہی کہ انبیاء کے معجزات کا معارضہ نہیں ہوسکتا اور دلیل اسپر یہ ہی کہ زمانۂ نبوت کو تیرہ سو برس سے زیادہ ہوگئے اور آجتک کوئی کسی معجزے کا معارضہ نہ کرسکا - حالانکہ اس عرصے میں بڑے بڑے حکماء و شعبدہ باز اور ساحر اور اہل ہنر پیدا ہوئے اور ضد اور عداوت جو باعث قصد خصومت و معارضہ ہوتا ہی پورے پورے موجود باایں ہمہ عاجز ہونا اس امر کی دلیل ہی کہ وہ معجزہ خدا کی طرف سے تھا اور جو خرق عادت سحر سے یا خواص اشیاء سے یا کرامت سے ہوتی ہی وہ معجزے سے ممتاز ہوتی ہی اسلیئے کہ سحر اور خواص اشیاء سے جو خرق عادت ہو وہ معجز یعنی عاجز کرنے والی نہیں ہوتی اسلیئے کہ اور آدمیوں سے اُسکا معارضہ ممکن ہی کرامت ولی سے ہوتی ہی اُسکے ساتھ دعویٰ رسالت نہیں ہوتا - اور چوتھے شبہ میں جن عجائبات کا ذکر کیا ہی وہ محض دعویٰ بے دلیل ہی -

اَوْكَالَّذِي مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا

یا مانند اُس شخص کے کہ گذرا ایک قریہ پر اور وہ گرا ہوا تھا اپنی چھتوں پر

م - حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہی کہ جب بخت نصر نے بنی اسرائیل پر چڑھائی کی تو بہت کچھ قتل و خون کیا بیت المقدس کو ویران کرڈالا اور بہت سے لوگوں کو قید کرکے اپنے ہمراہ لے گیا تھا اُن میں ایک عزیر بھی تھے ریہ اتفاق سے وہاں سے نکلے - اور اُسی قریہ میں جسکو بخت نصر نے ویران کردیا تھا داخل ہوئے اور ایک درخت کے نیچے اُترے اور اپنی سواری کے گدھے کو باندھ کر قریہ میں چکر لگایا اُسکو ویران دیکھ کر نہایت حیرت کیساتھ یہ کہا اَنّٰى يُحْيِي اللّٰهُ هٰذِهِ بَعْدَ مَوْتِهَا کب زندہ یعنی آباد کریگا اللہ اِس قریہ کو - یہ کہنا اُن کا قدرت خدا میں کسی شک کرنے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ویسے ہی عادۃً تھا کہ دیکھیئے کب یہ قریہ

آباد ہوتا ہی اُس قریہ کے درخت پھل رہے تھے آپنے انجیر۔ انگور کھائے اور انگور کا شیرہ نچوڑ کر پیا۔ کچھ میوہ اور انگور کا شیرہ اپنے پاس جہاں اُترے تھے رکھ لیا اور پڑکر سو رہے۔ بس اللہ تعالےٰ نے اُنکی سوتے ہی میں روح قبض کر لی اور سو برس تک مردہ ہی رکھا اور انکی طرف سے آدمیوں اور جانوروں کو اندھا کر دیا تھا کہ کوئی دیکھ نہ سکا۔ اِس عرصے میں بخت نصر ہلاک ہوا اور جو بادشاہ اُسکے بعد مالک سلطنت ہوا اُسنے بنی اسرائیل کو آزاد کر دیا کہ جاؤ بیت للقدس کو آباد کرو۔ یہ واپس آئے اور پہلے سے بھی زیادہ خوبصورتی کے ساتھ تعمیر کیا پھر جب سو برس کے بعد اللہ تعالےٰ نے عزیرؑ کو زندہ کیا اور پوچھا کہ تم کتنے دن پڑے رہے۔ عزیرؑ نے جواب دیا کہ ایک دن یا کچھ کم۔ (اور وجہ اِس کہنے کی یہ تھی کہ آپ صبح کے وقت سونے پڑے تھے۔ اور جب سو برس کے بعد مرکر زندہ ہوئے تو وہ عصر کا وقت تھا) اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ بلکہ سو برس۔ اپنے کھانے (یعنی انجیر وغیرہ) اور پینے (یعنی شیرہ انگور) کی طرف دیکھ کہ وہ سڑا تو نہیں۔ عزیرؑ نے جو دیکھا تو واقعی جیسے رکھے تھے ویسے پائے۔ پھر فرمایا کہ اپنے گدھے کو دیکھ اُسکو جو دیکھا تو وہاں سوائے ہڈیوں کے اور کیا دھرا تھا۔ سب جوڑ الگ الگ ہوئے پڑے تھے اتنے میں ایک آواز آئی کہ۔ اے پُرانی ہڈیو! ہم تم میں روح ڈالنے والا ہوں۔ اِس آواز کا آنا تھا کہ سب ہڈیاں آپس میں مل گئیں۔ پھر ایک عضو دوسرے عضو سے جا ملا۔ پسلی پسلی سے مل گئی۔ ہاتھ اپنی جگہ آ گئے غرضکہ تمام عضو اپنی اپنی جگہ پر آ گئے۔ پھر پٹھے اور رگیں۔ پھر اُن پر گوشت اُگا۔ گوشت پر جلد پھیل گئی اور جلد پر بال اُگ آئے۔ پھر اُس میں روح پھونکی گئی تو گدھا کھڑا ہو کر بولنے لگا۔ یہ دیکھ کر عزیرؑ سجدہ میں گر پڑے۔ اور کہا کہ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (اب ذرا سید صاحب کی عالی دماغی بھی ملاحظہ فرمایئے ۔ لکھتے ہیں)

س۔ درحقیقت وہ گذرا نہیں تھا بلکہ اُس نے **خواب** میں دیکھا تھا کہ میں ایک قریہ پر گذرا ہوں جو ویران پڑا ہے۔ اور وہ شخص گذرنے والا جہانتک تحقیق کیا ہے تاریخی واقعات سے حضرت نحمیا معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت نحمیا کو بیت المقدس کی تعمیر کی بڑی فکر تھی اور خدا کے سامنے ہمیشہ التجا و دعا کیا کرتے تھے بلا شبہ اُنکے دل میں یہ بات گذری ہوگی کہ اِس شہر

کے مرجانے یعنی ویران ہوجانے کے بعد کس طرح اللہ تعالیٰ اسکو زندہ یعنی آباد کریگا - انہیں تردد ات اور خدا سے التجا کرنے کے زمانے میں جیسا کہ مقتضائے فطرتِ انسانی ہی حضرت نحمیاہ نے خواب میں دیکھا اور اُن کو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس آباد اور تعمیر ہوجائے گا - اُسی خواب کا ذکر اس آیت میں ہی اور وہ خواب یہ ہی کہ انہوں نے دیکھا کہ میں ایک قریہ میں گیا ہوں جو بالکل ڈھے گیا اور ویران پڑا ہی - خواب ہی میں اُنہوں نے کہا کہ اِس قریہ کے اس طرح مرجانے یعنی ویران ہوجانے کے بعد کس طرح خدا اُسکو زندہ یعنی آباد کریگا - اُسی حالت میں اُنہوں نے دیکھا کہ مَیں مرگیا ہوں اور پھر جی اُٹھا ہوں - خواب ہی میں اُن سے کسی نے کہا کہ کتنی دیر تک تم پڑے رہے - اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ تو نہیں بگڑیں - اور اپنے گدھے کو دیکھ کیا حال ہوگیا ہی - اور دیکھ کہ اُسکی ہڈیوں پر کس طرح گوشت چڑھتا ہی - اِس عجیب خواب سے اُنکو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس ضرور تعمیر ہوجاوے گا - پس یہی قصّہ اِس آیت میں بیان ہوا ہی مفسروں کی عادت ہی کہ سیدھی بات کو بھی ایک اعجوبہ بات بناکر بیان کرتے ہیں اور سُنی سُنائی باتیں ناتحقیق قصّے اور کہانیاں اسمیں شامل کردیتے ہیں - اِس طرح اسمیں بھی کیا ہی - قرآن مجید کا سیاق کلام اِس طرح پر واقع ہوا ہی کہ جو قصّے اُنمیں بیان ہوئے ہیں اُن کا مقصد بیان کرنے پر اکتفا کیا ہی - چنانچہ حضرت یوسف کے خواب کا جہاں ذکر ہے وہاں بھی اِسی طرح ہوا ہی - کہ حضرت یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ مَیں گیارہ ستاروں اور چاند اور سورج کو اپنے تئیں سجدہ کرتے دیکھا اور یوں نہیں بیان کیا کہ مَیں نے خواب میں دیکھا کہ چاند اور سورج مجکو سجدہ کرتے ہیں -

م - سید احمد خاں اِس امر کے زیادہ مدعی ہیں کہ مَیں سیاق کلام سے معنی نکالتا ہوں - چنانچہ اِس موقع پر سارا قصّہ بیان کرکے حضرت یوسف علیہ السّلام کے خواب کے قصّے سے استدلال کیا - کہ دیکھو حضرت یوسف علیہ السّلام نے یہ نہیں کہا کہ مَیں نے چاند اور سورج کو خواب میں سجدہ کرتے دیکھا حالانکہ یہ خواب ہی تھا - افسوس ہی اِس جہالت اور

نادانی پر۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے اِس قول اِنِّی رَأَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا میں رَأَیْتُ
کے معنی ہی یہ ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا۔ رویہ کے معنی مطلق دیکھنے کے بھی آتے ہیں اور
خواب دیکھنے کے بھی۔ ہم اس کی تائید میں سورہ یوسف ہی کی ایک ایسی آیت پیش کرتے
ہیں کہ جسمیں رویت کے دونوں معنے کی پوری تصدیق ہوتی ہے . . . . وَدَخَلَ مَعَهُ
السِّجْنَ فَتَیٰنِ ط قَالَ اَحَدُهُمَا اِنِّیْ اَرٰىنِیْ اَعْصِرُ خَمْرًا ط وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْ اَرٰىنِیْ
اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ ط نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ج اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ
الْمُحْسِنِیْنَ ط یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قیدخانہ میں دو جوان اور داخل ہوئے
اُن میں سے ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں اپنے آپ کو شراب نچوڑتا ہوا دیکھا ہے۔ اور
دوسرے نے کہا کہ میں نے خواب میں اپنے سر پر روٹیاں دیکھی ہیں کہ اُس میں سے پرند
کھا رہے ہیں آپ اس کی تاویل بتا دیجئے۔ آپ کو ہم نیک آدمیوں میں سے دیکھتے ہیں۔
اب دیکھیے اِنِّیْ اَرٰىنِیْ اَعْصِرُ خَمْرًا اور اِنِّیْ اَرٰىنِیْ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا میں اَرٰىنِیْ۔ اَرٰىنِیْ
کے معنی خواب دیکھنے کے ہیں اور اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ میں نَرٰىكَ کے معنی مطلق
دیکھنے کے ہیں بفضلہ تعالیٰ یہ آیت ہم نے ایسی پیش کی ہے کہ اسمیں نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ کی وجہ
سے کسی اور تاویل کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ علاوہ اِسکے حضرت یوسف علیہ السلام کے بیان
کرنے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ فرمانا لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ (اپنا خواب بیان
مت کرنا) صاف بتا رہا ہے کہ رَأَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ میں رَأَیْتُ کے معنی یہی ہیں کہ میں نے
خواب میں دیکھا اور اس آیت اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ الخ میں کوئی لفظ بھی ایسا
نہیں ہے جس سے خواب کا قصہ معلوم ہو۔ یہ سید صاحب ہی کی خواب پریشانی ہے جسکو
نادان پرست لوگ الہام سمجھ گئے ہیں۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ
جب کہا فرشتوں نے اے مریم | بیشک اللہ بشارت دیتا ہے ایک کلمہ کی | کہ نام اسکا مسیح بن مریم ہے

س - عیسائی اور مسلمان دونوں یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ صرف خدا کے حکم سے عام انسانی پیدایش کے برخلاف بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے - حالانکہ حضرت مریم کا رشتہ یوسف سے ہوا تھا اور یہودیوں کے یہاں رشتے کا یہ دستور تھا جیسے کیتھو سیکلو پیڈیا میں لکھا ہی کہ مرد اور عورت میں اقرار ہو جاتا تھا کہ اسقدر میعاد کے بعد شادی کریں گے یہ اقرار یا تو ایک باقاعدہ تحریر یا معاہدے کے ذریعے سے گواہوں کی موجودگی میں ہوتا تھا یا بغیر تحریر کے اس طرح پر ہوتا تھا کہ مرد عورت کو گواہوں کے سامنے ایک ٹکڑا چاندی کا دیتا تھا اور یہ لفظ کہتا تھا کہ اِس امر کی کفالت میں قبول کر کہ اتنے دنوں بعد تو میری زوجہ ہو جاوے گی - (یہاں تک تو کیتھو سیکلو پیڈیا کی عبارت ہی اب آگے سید صاحب اپنی رائے لکھتے ہیں جو اصل کتاب سے زائد معلوم ہوتی ہی - ۱۲ - م) یہ معاہدے حقیقت میں عقد نکاح کے تھے صرف زوجہ کا گھر میں لانا باقی رہتا تھا اور وہ اُس میعاد پر ہوتا تھا جو اُس معاہدے میں قرار پاتی تھی - اِس کی مثال بالکل ایسی ہی جیسی کہ مسلمانوں کے ہاں فاتحہ خیر ہوتی ہی جو درحقیقت ایک نکاح ہی - لیکن زوجہ فی الفور گھر میں نہیں لائی جاتی - یا جیسے کہ اب بھی بعض دفعہ مسلمانوں میں یہ نکاح بہ تحریر خط لکھا جاتا ہی اور زوجہ کا شوہر کے گھر بھیجنا کسی آئندہ وقت پر ملتوی رہتا ہے - یہودیوں کے ہاں اِس رسم کے ادا ہونے کے بعد مرد و عورت باہم شوہر اور زوجہ ہو جاتے تھے - اور پھر بجز اسکے کہ زوجہ اپنے شوہر کے گھر رہنے کو اِس مدت کے بعد بھیجدی جاوے اور کوئی رسم جس پر جواز تزوج منحصر ہو عمل میں نہیں آتی تھی - یہاں تک کہ اگر بعد اِس رسم کے اور قبل رخصت کرنے کے اُن دونوں سے اولاد پیدا ہو تو وہ ناجائز اولاد تصور نہیں ہوتی تھی بلکہ بے گناہ شرعی اولاد جائز تصور ہوتی تھی -

م - ناظرین آپ خوب غور فرمالیں کہ کیتھو سیکلو پیڈیا کی جو عبارت سید صاحب نے نقل کی ہی کہ بذریعہ تحریر یا چاندی کا ٹکڑا دیکر مرد یہ کہتا تھا کہ اِس امر کی کفالت میں قبول کر

کہ اتنے دنوں بعد تو میری زوجہ ہو جاوے گی اس سے صرف رشتہ کی رسم ادا ہونا معلوم ہوتی ہی
اور یہ بعینہ وہ رسم ہے کہ جس کا اِس وقت تک بعض جگہ مسلمانوں میں رواج پایا جاتا ہی صرف
اتنا فرق ہی کہ مسلمانوں میں لڑکی کی طرف سے لڑکے کو نقد وغیرہ رشتے کے استحکام اور لڑکے
والوں کے اطمینان کی غرض سے دیا جاتا ہی۔ جسکو نشانی کہتے ہیں اور یہودیوں کے ہاں
مرد کی طرف سے عورت کو دینا لکھا ہی۔ اور یہ جو سید صاحب نے لکھا ہی کہ اب بھی بعض
دفعہ مسلمانوں میں یہ نکاح بہ تحریر خط عمل میں آتا ہی یہ بالکل غلط اور محض جھوٹ ہی کیونکہ
جو خط لکھا جاتا ہی وہ نکاح کی تاریخ معین کرنے کو لکھا جاتا ہی نہ کہ نکاح کے لیئے۔ عورت
منکوحہ جبھی شمار ہوتی ہی کہ جب ایجاب و قبول ہو جاتے ہیں یہ دوسری بات ہی کہ نکاح
ہونے کے بعد رخصت کچھ دنوں کے لیئے ملتوی کر دی جائے۔ لیکن صرف رشتہ کی رسم
ادا ہونے سے وہ دونوں شوہر زوجہ نہیں شمار ہوتے نہ اُن دونوں میں کوئی ایک دوسرے
کا وارث ہوتا ہی۔ پس اگر کیٹو سیکلو کی اِس عبارت کو ہم تھوڑی دیر کے
لیئے صحیح بھی تسلیم کر لیں تو اس سے حضرت مریم علیہا السلام کا یوسف کے ساتھ صرف
رشتہ ہونا معلوم ہوتا ہی اور سید صاحب نے جو کھینچ تان کر اِس رشتہ کو مثل نکاح کے
قرار دیا ہی اس سے صرف یہ بچاؤ کیا ہی کہ کوئی ان پر حضرت مریمؑ کو متہم کرنے کا الزام
نہ لگائے۔ کیونکہ اس کی سند سید صاحب کو کیٹو سیکلو پیڈیا سے بھی نہیں ملی کہ اِس
رشتہ کی رسم ادا ہونے سے مدت مقررہ کے بعد حضرت مریمؑ یوسف کے گھر زوجہ ہو کر
چلی گئی تھیں سید صاحب کی یہ عادت ہی کہ یہ جب اپنا کوئی خیالی ڈھکوسلہ بگھارنا
چاہتے ہیں تو جہاں اُس ڈھکوسلہ کی مؤید کوئی روایت انجیل وغیرہ کی کہیں سے ملجاتی ہی
تو اُسکو بڑے فخر کے ساتھ سند میں پیش کر دیتے ہیں جو اُن کے حق میں ڈوبتے کو تنکے کا
سہارا ہوتی ہی۔ علماء پر دوسروں کی پیروی کا الزام جیسا کچھ آپ لگاتے ہیں وہ تو ناظرین
سے پوشیدہ نہیں رہا لیکن یہ عجیب لطف کی بات ہی کہ خود جب اِس طرف متوجہ ہوتے ہیں تو

صفحے کے صفحے عیسائیوں وغیرہ کی کتابوں سے نقل کر دیئے ہیں چنانچہ اس بحث میں لکھتے ہیں
کہ انجیل متی باب ۱ درس ۱۶ میں لکھا ہی کہ یوسف مریم کا شوہر تھا - لوک کی انجیل باب ۲
درس ۲۷ والہ میں یوسف اور مریم کو حضرت عیسےٰ کا ماں باپ کہہ کر تعبیر کیا ہی - ان تمام
سندوں سے ثابت ہوتا ہی کہ حضرت مسیح اپنے باپ یوسف کے تخم سے پیدا ہوئے نہ کہ
بغیر باپ کے - کیا خوب - دیکھا کیا خوش ہو کر سید صاحب نے عیسائیوں کی کتابوں سے
ثبوت پیش کیا ہی اب ہم سید صاحب کی ایک اور بیہودہ اور لچر تاویل بیان کر کے اس
بحث کو ختم کرتے ہیں - ،، وہ یہ کہ آپ لکھتے ہیں کہ " بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں
ہر جگہ حضرت عیسےٰ کو ابن مریم کہا گیا ہی اگر اُن کے کوئی باپ ہوتا تو اُن کی ولدیت باپ
کی طرف منسوب کی جاتی - نہ ماں کی طرف - مگر دلیل نہایت بودی ہے - کیونکہ جب قرآن
نازل ہوا تو حضرت عیسےٰ - یہود اور نصاریٰ دونوں میں ابن مریم کے لقب سے مشہور
تھے - وہی مشہور لقب اُن کا قرآن میں بھی بیان کیا گیا ہے - انتہی

م - کسی دلیل کو بودی کہہ دینے سے کام نہیں چلتا - اس کی معقول وجہ بیان
ہونی چاہیے کہ یہود و نصاریٰ میں حضرت عیسےٰ ابن مریم کے لقب سے کیوں مشہور رہے
ابن یوسف سے کیوں نہ ہوئے - دوسرے یہ کہ بشارت جو دی گئی وہ حضرت مریم ہی
کو کیوں دی گئی ورنہ ایسے لایق بیٹے کی بشارت کا مستحق باپ تھا جیسے کہ حضرت زکریا
علیہ السلام کو بشارت دی گئی تھی - إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ
اور تیسری بات یہ ہی کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو قرآن مجید میں اور جگہ عیسےٰ بن مریم کہنے کی یہ
تاویل تو ہو بھی سکتی ہی کہ آپ یہود و نصاریٰ میں اس لقب سے مشہور ہو گئے تھے
لیکن پیدا ہونے اور مشہور ہونے سے پہلے الفاظ بشارت میں کیوں مسیح عیسےٰ بن مریم
کہا گیا تھا پس اس سے یہی معلوم ہوتا ہی کہ بشارت میں ابن مریم کہنے سے آپ کی پیدائش
بلا باپ کے ہونے کو ظاہر کرنا اور حضرت مریم علیہا السلام کو تہمت سے محفوظ رکھنا منظور تھا

اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَعَلٰی وَالِدَتِکَ

اور جب کہیگا اللہ اے عیسے مریم کے بیٹے یاد کر میری نعمت کو اپنے پر اور اپنی ماں پر

اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَھْلًا

جبکہ مدد دی میں نے تجکو روح پاک سے کلام کرتا تھا تو لوگوں سے گھوارہ میں اور اخیر عمر میں

م اِس مقام پر خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُن احسانات کو یاد دلایا ہی جو اُن پر بچپن اور جوانی اور زمانہ نبوت میں کیے تھے اُن میں تکلم فی المھد اور خلق طیر۔ اندھوں کوڑھیوں کا اچھا کرنا۔ مردوں کا زندہ کرنا (یہ چار اُمور قابل بحث ہیں جن سے سید احمد خاں قطعی انکار کرتے ہیں تکلم فی المھد (گھوارہ میں بولنے کی نسبت لکھتے ہیں کہ) ان آیتوں میں مھد کے لفظ سے صرف صغرسنی کا زمانہ مراد ہے نہ وہ زمانہ جس میں کوئی بچہ بمقتضائے قانون قدرت کلام نہیں کر سکتا۔ انتہی

- مھد کے معنی گہوارہ کے ہیں سید صاحب نے بھی اپنی تفسیر میں گہوارہ ہی ترجمہ کیا ہی۔ اب ظاہر ہی کہ گہوارہ میں بچہ کی جو حالت ہوتی ہی ایسے وقت میں اُنکا بولنا واقعی ان کی خصوصیات سے تھا۔ اور اگر گہوارہ سے صغرسنی یعنی وہ عمر جس میں بچے عموماً بولا کرتے ہیں تو اس کو خدا کی نعمت سمجھ کر یاد دلانا سمجھ میں نہیں آتا۔ جس عمر میں اور بچے بھی بولنے لگتے ہیں حضرت عیسیٰ ع ہی کا بولنا کیا عجب تھا۔ پس ضرور ہی کہ اس صورت میں خدا کا کلام عبث اور لغو شمار ہوگا (و نعوذ باللہ منہا) ناظرین! اس تفسیر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یا تو سید صاحب کے دل میں واقعی خدا کے کلام کی کچھ وقعت نہیں تھی جو وہ ایسے معنی بیان کر گئے جس سے اس کلام کا حشو و زوائد سے مملو ہونا پایا جاتا ہی۔ یا عقل کو کالج کی دُنیا میں دفن کر چکے ہوں گے جو تفسیر لکھنے کے وقت ایسے لایعقل و مجنون ہو بیٹھے تھے۔ بہرحال افسوس ہی افسوس ہی۔

فرشتہ نے جب حضرت مریم علیہا السلام کو بشارت دی تو ساتھ کے ساتھ یہ صفت

بیان کردی کہ وہ تیرا بیٹا گہوارہ میں بولیگا جیسا کہ سورۂ آل عمران میں ہی۔ خود خداوند جل و علےٰ شانہ یاد دلاتے ہیں کہ ہم نے گہوارہ میں تجھے بولتا کیا تو کیا یہ معمولی بات تھی جو اس اہتمام سے بار بار بیان کی گئی اور اگر آپ عادۃً اپنی عمر میں بولتے تو بشارت میں اسکے ذکر سے کیا حاصل تھا خدا کے یاد دلانے میں کیا اظہار نعمت ہوتا ہی۔

م۔ خلق طیر یعنی جانوروں کا پیدا کرنا۔ ایک روز عیسےٰ علیہ السلام لڑکوں کے ساتھ بیٹھے تھے آپ نے گارا لیا اور لڑکوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تمھارے لیے اِس گارے سے پرند بنا دوں اللہ کے حکم سے۔ لڑکوں نے کہا کہ ہاں۔ پھر آپ نے پرند کی تصویر بنائی اور اُس میں پھونکا۔ پھر فرمایا کہ ہو جا پرند اللہ کے حکم سے۔ پس وہ فوراً ہاتھ میں سے نکلکر اُڑنے لگا لڑکوں نے وہاں سے جا کر تمام لوگوں میں یہ بات مشہور کردی۔ پھر جب آپنے نبوت کا دعویٰ کیا اور معجزات کو ظاہر کیا تو لوگوں نے بہت کچھ جھگڑا کیا اور کہا کہ آپ ایک شپّر بنا دیجئے آپ نے اسی طرح اس وقت بھی گارے کی ایک تصویر بنا کر اُس میں پھونکا خدا کے حکم سے شپّر بن کر اُڑنے لگی اور شپّر بنوانے کی وجہ یہ تھی کہ یہ ایک عجیب الخلقت جانور ہی دن کو اندھا رات کو سونکھا علاوہ ازیں اس کے کان ہوتے ہیں رپستان ہوتے ہیں۔ اور کئی باتوں میں دوسرے جانوروں سے نرالا ہوتا ہی جسکا بنانا اُن کے گمان میں مشکل معلوم ہوتا تھا۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت عیسےٰ علیہ السّلام کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی نسبت خدا نے سورۂ آل عمران میں حضرت عیسےٰ کی زبان سے یوں فرمایا ہی کہ انی اخلق لکم من الطین کھیئۃِ الطیر فانفخ فیه فیکون طیرًا باذن الله۔ اور سورۂ مائدہ میں یوں فرمایا ہی اذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیها فتکون طیرًا باذنی۔ اب اس پر بحث یہ ہی کہ کیا درحقیقت یہ معجزہ تھا۔ اور کیا درحقیقت قرآن مجید

سے اُن مٹی کے جانوروں کا جاندار ہوجانا اور اُڑنے لگنا ثابت ہوتا ہے۔ تمام مفسرین اور علمار اسلام کا جواب یہ ہے کہ ہاں (یہ جواب بالکل ٹھیک ہے یہی قرآن سے ثابت ہوتا ہے ۱۲ م) اور ہمارا جواب یہ ہے کہ نہیں (آپ اس نہیں کو ہرگز ثابت نہیں کر سکتے ۱۲ م) بشرطیکہ دل و دماغ کو اُن خیالات سے جو قرآن مجید پر غور کرنے اور قرآن مجید کا مطلب سمجھنے سے پہلے عیسائیوں کی صحیح و غلط روایات کی تقلید سے بٹھالیے ہیں خالی کرکے نفس قرآن مجید پر بنظر تحقیق غور کیا جاوے (آپ کی نظر تحقیق میں ہمیشہ قصور رہا ہے اور ہم نے یہ ثابت کر دیا ہے اور اب بھی کر دیں گے کہ آپ نے ہی عیسائیوں کی تقلید کرکے اُلٹو سیدھا کیا ہے ۱۲ م) سورۂ آل عمران میں جو یہ الفاظ ہیں کہ انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرًا باذن اللہ اس کے معنیٰ یہ ہیں (ذرا سنبھل کر ۱۲) کہ مٹی سے پرندوں کی مورتیں بناتا ہوں پھر اُن میں پھونکتا ہوں تاکہ وہ اللہ کے حکم سے پرند ہوجاویں اب اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ پھونکنے کے بعد درحقیقت وہ پرندوں کی مورتیں جو مٹی سے بناتے تھے جاندار ہوجاتی تھیں۔ اور اڑنے بھی لگتی تھیں +

م۔ آپ کی اس تحقیق سے خوب معلوم ہوگیا کہ آپ کو اللہ کے حکم سے کچھ ضد ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پرندوں کی مورتیں بنانا اور اُن میں پھونکنا اسکو تو آپ نے مان لیا لیکن آگے جو یہ فرمایا کہ یہ مورتیں اللہ کے حکم سے پرند ہوجاویں گی اس سے آپنے انکار کیا۔ اگر آپ سرے سے حضرت عیسیٰ ع کے مورتیں بناتے اور پھونکنے ہی کو نہ مانتے تو اِسپر بھی کچھ افسوس نہ تھا۔ افسوس تو اسپر ہے کہ آپ جہاں تک حضرت عیسیٰ ع کا فعل ہے اُس کو تو تسلیم کرتے ہیں اور جو خدا کا کام ہے جان ڈالنا اُس کو خلاف عقل اور خارج از امکان بتاتے ہیں۔ واہ جناب وا۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ آپ کیا تحقیق کرینگے اور کیا قرآن مجید کا مطلب سمجھیں گے پہلے خدا کی خدائی کے تو قائل ہوجائے۔

س۔ سورۂ مائدہ میں خدا تعالیٰ نے اس قصّے کو بعض واقعات متحقق الوقوع کے ساتھ بیان کیا ہی۔ اس پر اس خاص قصّے کا وقوع کہ وہ مٹی کی مورتیں پرند ہو جاتی تھیں ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں تمام واقعات متحقق الوقوع کو ماضی کے صیغوں میں بیان کیا ہی اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ اِذْ عَلَّمْتُکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ اِذْ کَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ عَنْکَ۔ اِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ۔ مگر مٹی کی مورتوں کے پرند ہو جانے کے قصّے کو مستقبل کے صیغے سے بیان کیا ہی جیسے کہ اِذْ تَخْلُقُ۔ فَتَنْفُخُ فَتَکُوْنُ۔ پس اس سیاق کے بدلنے سے یہ نتیجہ ہی کہ جس مضارع کے صیغے پر اذ کا اثر پہونچیگا وہ تو امر متحقق الوقوع ہو جاویگا اور جس صیغہ تک اُس کا اثر نہ پہونچیگا وہ امر غیر متحقق الوقوع رہیگا۔ اس کلام میں اذ کا اثر تخلق۔ تنفخ تک پہونچتا ہی اور تکون تک نہیں پہونچتا۔ پس اُن مٹی کی مورتوں کا جاندار ہونا غیر متحقق الوقوع باقی رہتا ہی یعنی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ درحقیقت وہ مٹی کی مورتیں جاندار اور پرند ہو بھی جاتی تھیں بلکہ صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہی کہ حضرت عیسےٰ بچپنے میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں مٹی کے جانور بناتے تھے اور جیسے کبھی کبھی اب بھی ایسے موقعوں پر بچے کھیلنے میں کہتے ہیں کہ خدا ان میں جان ڈال دیگا وہ بھی کہتے ہونگے۔

م۔ آپکے اس قاعدے اذ کا اثر پہونچنے نہ پہونچنے کا اثر تو اُن پر پڑیگا جو آپ کو جدید علم کلام کا بانی سمجھتے ہیں۔ باقی ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ تخلق۔ تنفخ کو مستقبل کا صیغہ دیکھ کر جو آپکے یہ توجیہ کی ہی اس سے آپ کی عالی دماغی کا پورا پتہ چل گیا۔ افسوس ان دونوں کو مستقبل کے صیغے تو بتا دیئے لیکن یہ نہ سوچا کہ اِذْ آنے سے انکے معنی ماضی کے ہوگئے ہیں اس لیئے باعتبار معنی کہیں بھی سیاق نہیں بدلا۔ اور یہ اکثر مواقع قرآن مجید میں موجود ہی کہ جب اللہ جل شانہ نے اپنے کسی گذشتہ فعل کا اظہار فرمایا ہی تو بصیغہ ماضی فرمایا ہی جو اذ آنے سے بھی اپنے معنوں میں خاص

رہتی ہی بہ کسی جگہ بھی نہیں ہی کہ اپنی گذشتہ نعمت یا گذشتہ عذاب کا ذکر بصیغہ مضارع بمعنی ماضی فرمایا ہو بلکہ جہاں دیکھیے اصل ماضی کا صیغہ نکلے گا جیسے وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى اور ایسے صیغے ہیں جو ہر وقت اپنے معنی میں مستقل ہاہے بیان فرمانے سے اِس طرف اشارہ ہی کہ ہم میں جیسی قدرت اُس نعمت کے عطا کرنے (یا عذاب کے نازل کرنے) کی اُس وقت تھی اب بھی ویسی ہی ہی۔ بخلاف بندوں کے کہ اُن کی حالت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی ہی کبھی وہ ایک فعل پر قادر ہوتے ہیں کبھی نہیں ہوتے۔ اس لیئے اُن کے گذشتہ افعال کا ذکر کہیں بصیغہ ماضی فرمایا ہی کہیں بصیغہ مضارع بمعنی ماضی۔ پس اَيَّدْتُكَ اور عَلَّمْتُكَ میں چونکہ تائید وتعلیم جناب باری کے ساتھ مخصوص ہی اس لیئے اُس میں ماضی کا صیغہ لایا گیا اور تخلق اور تنفخ میں بنانا اور پھونکنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فعل تھا اس لیئے اسکو مضارع بمعنی ماضی لانے میں کچھ حرج نہیں ہوا اور سیدھی بات یہ ہی کہ سورۂ آل عمران میں بھی یہ مضمون بصیغہ مضارع بیان ہوا ہی اور سورۂ مائدہ میں بھی بصیغہ مضارع ہوا ہی صرف اتنا فرق ہی کہ وہاں حضرت عیسے علیہ السلام کی زبان سے صیغہ متکلم لایا گیا ہی اور یہاں صیغہ مخاطب اَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّيْنِ۔ فَاَنْفُخُ فِيْهِ (آل عمران) اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ۔ فَتَنْفُخُ فِيْهَا (مائدہ)۔ بس اب آپ کے اس خلجان اور وہم کی کہ صیغہ مستقبل سے سیاق بدل گیا ہے کچھ بھی اصل نہیں رہی۔ سر پکڑیئے اور روئیے۔ .... اور رہا معجزے کا ثبوت۔ سو اگر سورۂ مائدہ کی ان آیتوں پر تھوڑی دیر غور کر لیا جاوے تو پھر کوئی بھی شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ دیکھیے کلام پاک ہی۔ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ۔ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ۔ یہاں بِاِذْنِيْ دو جگہ فرمایا۔ جس سے معلوم ہوتا ہی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

جانوروں کی تصویریں بھی خدا کے حکم سے بنایا کرتے تھے اور اُن میں جان بھی خدا کے حکم سے پڑتی تھی خلاصہ آیت کا یہ ہی اذ تخلق من الطین باذنی - فتکون طیرا باذنی پس جب آپ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی تصویریں بنانے کو صحیح مانتے ہیں تو یہ لابدی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ خدا کے حکم سے بناتے تھے اور جب تصویروں کا بنانا خدا کے حکم سے تسلیم ہوگیا تو اُن میں خدا کے حکم سے جان پڑجانے کو نہ ماننے کی کوئی وجہ سوائے ظلمت کفر کے اور نہیں ہوسکتی - فتدبروا ایھا الناظرون بارک اللہ فیکم -

اور یہ جو آپ نے لکھا ہی کہ صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہی کہ حضرت عیسیٰؑ بچپن میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں مٹی کے جانور بناتے تھے اور جیسے اب بھی کبھی کبھی ایسے موقعوں پر بچے کھیلنے میں کہہ دیتے ہیں کہ خدا ان میں جان ڈالدے گا وہ بھی کہتے ہونگے" اس سے تو خدا کے کلام کے لغو اور فضول ثابت ہونے میں کوئی کسر ہی نہیں رہتی - ہائے افسوس حضرت عیسےٰؑ نے تو بچپن میں ویسے ہی کہا جیسے کہ اب بھی بچے کھیلنے میں کہہ دیتے ہیں کہ خدا ان میں جان ڈالدے گا - اور خدا نے اس کھیل کی بات کو بطور نعمت کے یاد دلایا ہی معلوم ہوا کہ جیسے آپ بکواسی اور لغوگو ہیں ایسے ہی خدا کو بھی ایک چھچھورا سمجھ لیا ہی جو بچوں کے کھیل کا بھی اظہار بار بار کرتا ہی نعوذ باللہ من ذالک -

اندھوں اور کوڑھیوں کا چنگا کردینا - اور مردوں کا زندہ کردینا - ہم یہ دونوں معجزے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے مشہور و معروف ہیں آپ کے پاس جو مریض آنے کی طاقت رکھتا تھا اُس کے لیے بھی دعا فرمایا کرتے تھے اور جو ضعیف ہوتا تھا اور آپ کے پاس تک نہیں آسکتا تھا آپ اُس کے پاس خود تشریف لیجا کر دعا فرمایا کرتے تھے اور آپ کی دعا یہ تھی اَللّٰھُمَّ اِلٰہُ مَنْ فِی السَّمَآءِ وَاِلٰہُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَا اِلٰہَ

فیھما غیرک وانت جبار من فی السماء وجبار من فی الارض لا جبار فیھما غیرک وانت ملک من فی السماء وملک من فی الارض لا ملک فیھما غیرک قدرتک فی الارض کقدرتک فی السماء وسلطانک فی الارض کسلطانک فی السماء اسئلک باسمک الکریم ووجھک المنیر وملکک القدیم انک علی کل شئ قدیر اور آپ کے مردہ زندہ کرنے کی یہ دعا تھی یا حی یا قیوم یوں تو آپ سے ہر قسم کے مریض شفا پاتے تھے لیکن کوڑھی اور مادر زاد اندھوں کا ذکر اس لیئے ہوا کہ یہ دونوں علاج نہایت مشکل ہیں۔ بڑے بڑے طبیب ان سے عاجز ہیں چونکہ آپ کے زمانے میں بڑے بڑے حاذق طبیب کثرت سے موجود تھے اس لیئے اللہ تعالے نے یہ معجزہ از قسم طب عطا فرمایا جیسا کہ حضرت موسے علیہ السلام کے زمانے میں سحر کا بہت زیادہ غلبہ تھا اس لیئے آپ کو عصا اور ید بیضا کا معجزہ عطا ہوا اور ہمارے حضور سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰت کے زمانے میں فصاحت و بلاغت کا بہت چرچا تھا اسی لیئے قرآن کا معجزہ باعتبار فصاحت کے عطا کیا گیا۔

س۔ خدا تعالےٰ نے سورہ آل عمران میں حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے اس طرح فرمایا ہے کہ وابری الاکمہ والابرص واحی الموتیٰ باذن اللہ اور سورہ مائدہ میں یوں فرمایا ہے وتبری الاکمہ والابرص باذنی واذ تخرج الموتیٰ باذنی۔ علمائے اسلام کی عادت ہے کہ قرآن مجید کے معنی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایت کے مطابق بیان کیا کرتے ہیں اس لیئے اُنھوں نے اِن آیتوں کے یہی معنی بیان کیے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اندھوں کو آنکھوں والا اور کوڑھیوں کو چنگا کرتے تھے اور مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ انجیلوں میں بھی اس قسم کے بہت سے معجزے حضرت مسیح کی نسبت بیان ہوئے ہیں مگر نہایت تعجب ہے کہ خود انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت

عیسٰے نے جب اُن سے فروسیوں اور صدوقیوں نے آسمانی معجزہ طلب کیا تو انہوں نے
معجزے کے ہونے سے انکار کیا - پھر کیونکر اس قدر معجزے حضرت مسیح کی انجیلوں میں
مذکور ہیں پس اگر موجودہ انجیلوں پر تاریخانہ تحقیق سے نظر ڈالی جاوے تو اس سے
زیادہ سچ اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہودی ہمیشہ جھاڑا پھونکی کی عادت رکھتے تھے
بیماروں کے لیئے دعائیں پڑھ کر اُن کی صحت کے لیئے اُن پر دم ڈالتے تھے لوگوں
کو برکت دیتے تھے - لوگ کاہنوں - اماموں - اور مقدس لوگوں کے ہاتھ چومنے پاؤں
کو ہاتھ لگانے کپڑے کو چھونے یا بوسہ دینے سے برکت لیتے تھے اُسی دستور کے موافق
حضرت عیسٰے بھی بیماروں کو دعا دیتے تھے - اور لوگ آپ کے قدموں کو ہاتھ لگاتے
کپڑے کو چھوتے یا چومتے تھے - پس یہ ایک معمولی بات تھی اُس بیان کے ساتھ اس
بات کا اضافہ کرنا کہ جو اس طرح کرتا تھا وہ فی الفور اچھا ہو جاتا تھا - اندھے آنکھوں
والے ہو جاتے تھے اور کوڑھی اچھے ہوتے تھے اس قسم کی مبالغہ آمیز تحریریں ہیں
جیسے کہ بزرگوں کے حالات لکھنے والے لکھا کرتے ہیں -

م - ناظرین دیکھا آپ نے - اب تو آپ کو پورا یقین ہو گیا ہو گا کہ سید احمد
خاں ہی نے عیسائیوں کی کتابوں سے کاٹ چھانٹ کر کے اپنے آپ کو محقق اور مجدد
ثابت کیا ہے اور اُس پر طرہ یہ ہے کہ اُن کتابونکی روایتوں میں سے بھی جس کو چاہا یقین
کے قابل ٹھیرالیا اور جس کو چاہا رد کر دیا - واہ رے محقق تیرے کیا کہنے - خیال تو کیجے
کہ انجیل میں جو معجزات مذکور ہیں اُن کو تو بہتان سمجھے - اور فروسیوں اور صدوقیوں
کے حضرت عیسٰی علیہ السلام سے معجزہ طلب کرنے اور آپ کے انکار کرنے کو صحیح مان
لیا - اور دلیل خارجی دونوں کے لیئے ایک بھی نہیں - افسوس -

س - اندھے لنگڑے اور چوڑی ناک والے کو یا اُس شخص کو جس میں
کوئی عضو زائد ہو اور ہاتھ پاؤں ٹوٹے کو اور کبڑے اور ٹھنگنے کو معبد میں جانے اور

اور معمولی طور پر قربانیاں کرنے کی اجازت نہ تھی یہ سب ناپاک اور گنہگار سمجھے جاتے تھے اور عبادت سے یا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونیکے لائق متصور نہ ہوتے تھے حضرت عیسیٰؑ نے یہ تمام قیدیں توڑ دی تھیں اور تمام لوگوں کو کوڑھی ہوں یا اندھے یا لنگڑے چوڑی ناک کے ہوں یا پتلی ناک کے کبڑے ہوں یا سیدھے - ٹھنگنے ہوں یا لمبے سب کو خدا کی بادشاہی میں داخل ہونے کی منادی کی تھی - اور کسی کو عبادت کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے سے نہیں روکا - پس یہی اُن کا کوڑھیوں اور اندھوں کا اچھا کرنا تھا جہاں جہاں انجیلوں میں بیماروں کے اچھا کرنے کا ذکر ہی اُس سے یہی مراد ہی اور قرآن مجید میں جو یہ آیتیں ہیں اُن کے یہی معنی ہیں -

م - ناظرین ہم کو سید صاحب کی اِس تمام بکواس اور من گھڑت کو دیکھکر چنداں افسوس نہیں ہوتا - افسوس تو اُس جماعت پر ہوتا ہی کہ جو اس بھدّی لیاقت اور ٹیڑھی عقل والے کی پوچ سی پوچ اور لچر سی لچر بات کو الہامی سمجھ رہی ہی - اور اس کی زیادہ وجہ یہ معلوم ہوتی ہی کہ سید صاحب نے کالج قایم کرکے قوم کی اصلاح کی - سو اول تو کالج کو موجب اصلاح سمجھنے میں بہت کچھ کلام ہی اور اگر تھوڑی دیر کے لیئے مان بھی لیا جائے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تخریب دین کے مقابلے میں اِس فرضی اور موہوم نفع کی کیوں وقعت کی جاتی ہی - سید احمد خاں کی تفسیر دیکھنے سے یہ نتیجہ تو نہایت آسانی سے نکل آتا ہی کہ اُن کی رائے مذہبی امور میں صائب نہ تھی اسی وجہ سے مسلمانوں کو مذہبی نقصان بہت کچھ پہونچا ہی - سو اگر معاملہ برعکس ہوتا یعنی مذہبی امور میں اُن کے اقوال اسلام قدیم کے بالکل موافق ہوتے اور مسلمانوں کو مذہبی منافع بھی بے انتہا پہونچتے لیکن ساتھ کے ساتھ کوئی کرتوت ایسی کر گذرتے جس سے دنیوی نقصان متصور ہوتا تو یہ یقین کر لیجیے کہ سید صاحب پر ہر طرف سے بلا امتیاز امیر و غریب لعنت ہی لعنت برستی

اور اول درجے کے قومی غدار وسفاک ٹھیرائے جاتے دنیوی نقصان کے سامنے مذہبی نفع کا
کوئی ذرا بھی خیال نہ کرتا - مگر افسوس کہ اب دُنیا کے مقابلے میں تخریب دین کی ذرا پرواہ
نہیں کی جاتی - ایک مذہبی دشمن کو مصلح مانا جا رہا ہی اُس کے نام کے ساتھ مرحوم مغفور
علیہ الرحمۃ والغفران لکھا جاتا ہی - اور ایک عجیب لطف یہ ہی کہ اِس تخریب دین کو
بھی نیک نیتی پر مبنی سمجھ کر سید صاحب کو اِس الزام سے بری کرتے ہیں - چنانچہ اکثر
یہ سُننے میں آیا ہی کہ سرسید کو مدت سے یہ خیال تھا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام
کے حق میں جن مُضر نتائج کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہی اُن کا انسداد کیا جاوے اور
چونکہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کے باعث وہ خود تھے اس لیے اِس
کام کو اپنا ایک ضروری فرض سمجھ کر اپنے ذمہ لیا بس یہی غرض اُن کے تفسیر لکھنے
کی تھی اور اسی بنا پر اُنھوں نے مفسرین سے خلاف کر کے تعلیم سے جو جو شبہات
اسلام کے حق میں پیدا ہوتے نظر آئے اُن کا استیصال کیا - سید احمد خاں نے بھی
اپنی تفسیر کی غرض ایک اسپیچ میں یہی بیان کی تھی سو یہ غرض خوش اعتقاد نظروں میں
خواہ کیسی ہی نیک معلوم ہوتی ہو لیکن ہم تو اِس روغن آمیز تقریر کا یہ مطلب سمجھتے
ہیں کہ جب سید صاحب نے دیکھا کہ انگریزی تعلیم سے مذہب قدیم میں شبہات پیدا ہونگے
تو اُنھوں نے کاٹ تراش کر کے ایک ایسا مذہب بنا دیا کہ جس میں کسی کو کسی قسم کا شبہہ
ہی پیدا نہ ہو اور ظاہر ہی کہ جب مذہب مذہب ہی نہ رہا تو شبہہ ہی بیچارہ کہاں
سے پیدا ہوگا ہاں اگر سید صاحب مذہب کے اصل مسئلہ کو بحالہ قائم رکھ کر شبہات
کا استیصال کسی نئے طریقے سے کرتے تو ہم مان لیتے کہ واقعی انھوں نے نئے علم
کلام کی بُنیاد ڈالکر اسلام کی سچی حمایت کی اور ایک بہت بڑا کام انجام دیا ورنہ جس
موجودہ طریقے پر ناز کیا جاتا ہی اُس سے دراصل شبہات کا تو استیصال نہیں
ہوا ہاں مذہب کی بُنیاد باہر نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہی - آپ ہی انصاف کر دیجیے کہ

کہ اگر کوئی شخص فرشتوں کے وجود میں شبہ کرے تو کیا اس شبہ کے استیصال کا
یہی طریقہ ہی کہ خود بھی فرشتوں کا انکار کر بیٹھے اور فرشتوں پر ایمان رکھنے والوں کو دوچار
سنادے - ایسے ہی اگر کوئی معجزات کے متعلق سوال کرے تو کیا اُس کو اسی طرح
جواب دیا جائے گا کہ معجزات کا اعتقاد بالکل لغو و بیہودہ خیال ہی - لاحول ولاقوۃ
الا باللہ العلی العظیم - عقل چہ کتی ست کہ پیش مرداں بیاید - اور عقل بیچاری کا قصور
کیا ہی وہ اِن کی بوٹ کی ٹھوکروں سے ایسی تنگ آ کر فرار ہوئی ہی کہ قیامت تک
اِن کے پاس آنے کو بچی نہیں ہوگی - بس اب خیال کر لیجیے کہ جو لوگ عقل سے ایسی
دشمنی پیدا کر چکے ہوں وہ کس برتے پر اپنے آپ کو دنیوی ذمّہ دار سمجھتے ہیں اور
کس حوصلے پر مذہبی ٹھیکہ دار بننا چاہتے ہیں اِن کی عقیدتمندی سید احمد خاں کے
ساتھ اِس درجہ بڑھ گئی ہی کہ اِن میں ذرا بھی حق و باطل میں تمیز کرنے کی حس باقی
نہیں رہی یوں تو ہم اِن کی اِس نادانی اور ابلہی اور سید احمد خاں کی مکاری
اور ابلہ فریبی کا ثبوت وقتاً فوقتاً دیتے ہی رہیں گے لیکن کچھ تھوڑا سا یہاں بھی
سُنتے جائیے - حیات جاوید حصہ دویم (سوانح عمری سید احمد خاں مؤلفہ خواجہ الطاف حسین
صاحب حالی) کے صفحہ ۱۴۴ پر لکھا ہی کہ ایک صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس میں یہ رائے
ظاہر کی تھی کہ کانفرنس کے جلسوں میں تحسین کے موقعہ پر بجائے تالی بجانے کے
مرحبا یا جزاک اللہ کہا جایا کرے - سر سید نے اس سے سخت ناراضی ظاہر کی - اور

سلہ ہمیں اپنے اِس رسالہ میں صرف بانی کالج اور یونیورسٹی کا خواب دیکھنے والے کے عقیدے دکھانے منظور تھے
سو دکھا دئے باقی کالج اور یونیورسٹی کے متعلق ایک دوسرا مستقل رسالہ "کالج کا اسلام" لکھا ہی جس میں ہر
پہلو سے دونوں کے مقاصد اور نتائج پر پوری بحث کی گئی ہی یہاں صرف اتنا جتائے دیتے ہیں کہ جن لوگوں
کے ہاتھوں ۳۰ سال کے اندر مذہب نے ہزار ہا زخم کھائے ہوں جن کی صورت کو دیکھ کر مذہب کوسوں دور
بھاگتا ہو وہ اُس کی حفاظت کسی طرح نہیں کر سکتے بقول سعدی علیہ الرحمۃ ۔ نکند جور پیشہ سلطانی + کہ نیاید
ز گرگ چوپانی ۱۲

کہا کہ ایسے جلسوں میں جیسے کہ ہمارے جلسے دنیوی اغراض کے لیے ہوتے ہیں اِن الفاظ کو داخل کرنا جو شعائر اللہ میں داخل ہیں ان کی ہتک کرنا ہی" اب خیال کیجئے کہ اول تو یہ الفاظ شعائر اللہ میں داخل نہیں ہیں روزمرّہ تحسین و آفرین کے موقعہ پر بولے جاتے ہیں۔ دوسرے کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ حضرت اِس کو تو آپ عین دین سمجھتے ہیں یہ دنیوی کیونکر ہو گیا۔ مگر خوش اعتقادی سے یہ جرات کیسے ہوتی۔ وہ ناراضی سرسید کی الہامی ناراضی تھی اس کے سامنے کیسے کوئی دم مار سکتا تھا افسوس کسی کو ذرا بھی یہ خیال نہ ہوا کہ یہ اِس مکاری سے تمام اسلامی طریقوں کو نیست و نابود کرنا چاہتا ہی بس جو سُنا اُسی پر گردن جھکا دی۔ لوگ پیر کے جاہل مریدوں پر ہنسا کرتے ہیں مگر ہمارے نزدیک ان تعلیم یافتوں کی جہالت پر جتنا ہنسا جائے تھوڑا ہی اور جتنا رویا جائے کم ہی۔ مگر پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ اَبْ نہ ان پر ہنسنے کا وقت ہی نہ رونے کا۔ بلکہ دعا کا وقت ہی۔ پس ہر دیندار پر فرض ہی کہ نہایت عاجزی کے ساتھ گڑگڑا کر اور سجدے میں گر کر جناب باری میں دعا کرے ایسا نہ ہو کہ قیامت کے روز غریبوں اور عام لوگوں کے یہ فریاد کرنے پر رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا اے رب ہمارے ہم نے اپنے سرداروں اور سرِبراوردوں کی اطاعت کی انہوں ہی نے ہمیں راہِ حق سے گمراہ کیا" یہ لیڈرانِ قوم دوچند عذاب کے مستحق ٹھیریں۔ پس جو شخص دعا کرنا چاہے وہ جلد کرے اور یہ کرے۔ الٰہی اپنے نیک بندوں کے صدقے سے اپنے حبیب کے صدقے سے اپنی خدائی کے صدقے سے ہمارے امیروں ہمارے رئیسوں ہمارے نوابوں ہمارے جاگیرداروں کے دل دُنیا کی محبت سے سرد کر دے اور ان کو اپنی اور اپنے حبیب کی سچّی اور خالص محبت عطا فرما آمین۔ آمین۔ آمین۔ وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین ٥

داعی الراجی رحمۃ ربہ الصمد۔ مشتاق احمد اصلاح پسند ساکن قصبہ جھنجھانہ ضلع مظفرنگرہ جمادی الثانی ۱۳۲۹ھ